جہانِ دیگر

قرۃ العین حیدر

جہانِ دیگر

قرۃ العین حیدر

مکتبۂ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ترتیب

پیش لفظ

شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ:

"موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں پھولوں اور قوسِ قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے اُلفت۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے کمروں کا رنگ ہلکا ہے۔ پردے چمپئی۔ دریچوں میں بنفشہ کے شگوفے پڑے لٹکتے ہیں"

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی "شخصیت نگاریاں" اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ہم نہایت ذوق شوق سے رسالہ "شمع" بھی پڑھتے ہیں، اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل جمع ہو کر مسلسل ایک چنڈو خانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے ماشاء اللہ۔ ایک کمرے میں ریڈیو دھاڑ رہا ہے۔ دوسرے میں ایک بھانجی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں "چور ہے دوڑیو آئی" کھیلا جا رہا ہے۔ برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے متواتر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھانجی صاحبہ

اللہ کے فضل وکرم سے ڈاکٹر ہیں اور ایر فورس میں فلائیٹ لفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب، یونانی آرٹ، ہندو فنونِ لطیفہ سے شدید اُنس ہے اور کومکس کی تو آپ عاشق ہیں۔ ٹیل ٹلو اور ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو دفعتاً یاد آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں (انفرادیت وغیرہ ابنِ سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ سب گپ ماری ہے) ایک روز ہم حسبِ معمول گھاس پر بیٹھے (رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا) نہایت اطمینان سے شنکر آکو کیدآرا میں منتقل کرنے میں ـــــ مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے، اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریزی مصنف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی PITCH پر گذری ہے (کرکٹ کا PITCH نہیں) باوجودیکہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن واقعتہً بڑا زبردست انقلاب آچکا ہے اور بہرصورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہوگئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ شدید ذہانت اور شدید مزاحی حس سنی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی "خصوصیات" بھی زیادہ لوگوں کے پلّے نہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی اسی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ

دوسرے لمحے گھاس پر سے اُٹھ کر کینیڈا چلا گیا)

میری تین عزیز تر سہیلیاں[1] جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر ۱۹۴۷ء تک عمر کا ایک ایک لمحہ اکھٹے بِتایا تھا۔ ہندوستان میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری وطنِ مرحوم ہی میں رہ گئی۔

سہیلیوں سے قطعِ نظر ہم سب ماشاءاللہ سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچتا ہے) ان کے علاوہ خدا نظرِ بد سے بچائے، ان سب میں جو ہمارا اپنا ایج گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ الموڑے میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان "بیکٹ ہاؤس" تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہ جہان پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹڑی پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹڑی سے اُترے گی۔ بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا۔ غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہوئے تو اے لیجئے۔ ایک سے ایک عالم فاضل چلا آرہا ہے۔ دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹا کھٹ توڑ ڈالے ننھیال میں جو بہن بھائی ہیں۔ ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی ٹیکسٹائل ٹیکنولوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست دان بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ "قبیلے کا احساس" ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً

---

[1] لکھنؤ کی مشہور جپال سسٹرز۔ شکنتلا قدوائی، کملا جپال، ومِلا سمال

وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے جس کا ذکر میں نے یلدرم کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دور تک تتر بتر ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لنڈن میں۔ بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے۔ بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے۔ بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے۔ بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں۔ بچپن رنگا رنگ مناظر سے پُر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع، ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، جنوبی ہند کی بندرگاہیں، ایران کے ساحل، کربلائے معلیٰ، قاہرہ، ترکی۔ مستقل ادھر سے اُدھر گھوم رہے ہیں۔

پہلی کہانی بعمر چھ سال لکھی (ہاں صاحب! کیا بات ہے، ہونہار بروا۔) کہانی کچھ یوں تھی کہ "کاٹھ گدام کا اسٹیشن تھا، رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹینیں لیے ادھر اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ جگنو کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھلائی پڑی۔" وغیرہ وغیرہ ماشاءاللہ کس قدر شاعرانہ تخیّل تھا غور کیجیے کہ جگنوؤں کی قطاریں

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں۔ ان کے لیے باقاعدہ اسکول کھولا گیا تھا۔ ایک جرمن سہیلی نے بہت سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی بیلنڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ جچا نہیں مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی۔ اُس نے کسی بات پہ بگڑ کر کہہ دیا کہ بہرحال میرا گڈا خالص جرمن ہے۔ سیدھا برلن سے آرہا ہے۔ تمہاری "لیڈی بیلنڈا" گو بلونڈ ہے مگر تمہاری گڑیا ہے لہٰذا ہندوستانی ہے۔ اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی عرصے تک شدید اینٹی جرمن

جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی۔ اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو ـــــ فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرادی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگامے کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لیے لکھتے تھے، وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکٹوئی ہوئی جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی انگریزی میں کہہ گیا ہے۔

LITERARY SINS HAVE VERY LONG SHADOWS

یہ بہت ہی حسبِ حال مقولہ ہے یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں:

ایک خاتون ہماری ایک کتاب کی ورق گردانی کر کے نہایت اطمینان سے بولیں۔ "آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں!!" ـــــ اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ "میرے بھی صنم خانے" میں سوائے "پارٹیوں" کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیجئے۔ یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجیڈی کی داستان قلمبند کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بر خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں

اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں' ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں یا احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے COMPLEX میں گھرا ہوا ہے NORMAL کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت"۔ تو بھئی یہ تو ایک بڑا جید قسم کا خوفناک لفظ ہے شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری "شخصیت" — یہ کیا مسخرہ پن ہے!

قرۃ العین حیدر

اُڑن ہاتھی اور بڑھیا کا تنور

منجانب:۔ یوحنا عارف

اس کی طرف سے جو ہے اور جو تھا اور جو ہوگا۔ اور میں نے اپنے پیچھے نرسنگے کی آواز سنی کہ جو کچھ نظر آتا ہے، اس کو کتاب میں لکھ۔"

یہ روداد جہد البقاء میں ہارنے اور جیتنے والوں کی ہے۔ ظفریاب وہی ہوتے ہیں جنہوں نے خود کو فتح کا اہل بنایا۔ "خدا ان قوموں کی حالت نہیں بدلتا، جنہوں نے خود اپنی حالت نہیں بدلی۔" بقائے اصلح کا فطری قانون یہ نہیں دیکھتا کہ کون مشرک ہے، کون کلمہ گو، کون بُت پرست اور کون کمیونسٹ۔

ورجن کوٹن ایلیز بتھ اوّل سے لے کر ریسنگ کوئن ایلیز بتھ ثانی تک بنے ہوئے زمرّدیں شجر کے نیچے پھیلا چھوڑ کر امریکن اُڑن ہاتھی زمین سے تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا۔ مشرکین ارض و سمٰوٰت مسخر کرکے کرۂ قمر پر اپنی اناجیل چھوڑ آئے اور نصف کرۂ ارض پر حاوی ہیں اور ان کا تمدّن اپنانے اور ان کے طرز و معیارِ زندگی تک پہنچنے کے لیے "قدیم مشرقی روحانی تہذیبوں" کے نام لیوا بیتاب و مضطرب۔

سامنے فرسٹ کلاس میں نیویارک کے ایک سندھی تاجر کی عمر رسیدہ زوجہ ایک فربہ پنجابی لڑکی سے ایک مائیکرو ویو تنور کا تذکرہ کر رہی ہے جو اس نے حال میں خریدا ہے اور جس میں کھانا ۳ منٹ میں پک جاتا ہے۔

"یاد رکھو اور ایمان لے آؤ کہ دوسرا طوفانِ نوحؑ بڑھیا کے اس مائیکرو ویو تنور سے نکلے گا"

فربہ پنجابی لڑکی نے گلے میں اپنے تازہ ترین فیشن ایبل گرو کی مالا پہن رکھی ہے، جو فلاڈلفیا میں ٹھاٹھ کر رہا ہے۔

ادھر ملحد دہریے روسی کرۂ قمر پر اپنے ہتھوڑے اور درانتی کا نشان چھوڑ آئے ہیں اور باقی دنیا پر وہ حاوی ہیں۔

"ربّ المشرقین وربّ المغربین" یعنی خداوند تعالیٰ نے جن اہل اسلام کو چھپر پھاڑ کر بذریعہ تیل دولت عطا کی وہ بنیا پٹرو ڈالر پتی مسلمان فی الحال مونٹی کارلو اور لاس ویگاس جا رہا ہے اور جب تک اس دولت کو اُڑا نہ دے گا انشاءاللہ جاتا رہے گا۔

فرسٹ کلاس میں سندھی خاتون سے آگے چند عرب جلوہ گر ہیں۔ ہاتھ میں ان کے تفریح گاہوں اور ان قمار خانوں کے متعلق مفصل اطلاعات کے چمکیلے مصوّر رسالے ہیں "ملکۃ الملائکہ" جہاں پہنچ کر وہ لاکھوں پٹرو ڈالر جوئے میں ہاریں گے (کوئی مضائقہ نہیں اگر برصغیر پاکستان و ہند کے غریب مسلمان طلبا اسکول اور کالج کی فیس نہ ادا کر سکیں) ان عربوں کی بیویاں ناک پر لکڑی کی چونچ لگائے نقاب اوڑھے بیٹھی ہیں۔ یہ لندن اور پیرس میں بے دریغ خریداری کر کے آ رہی ہیں اور اب امریکہ میں بے دریغ خریداری کریں گی (کوئی مضائقہ نہیں اگر مصیبت زدہ فلسطین عورتیں اپنے شکستہ خیموں میں بمباری کا نشانہ بنتی رہیں)

اس خالی الذہن گروہ کی منزلِ مقصود امریکہ کی "سلور اسٹیٹ" نیوادا کا شہر لاس ویگاس ہے جو شہر ہسپانیوں نے بسایا تھا۔ اور جو پچھلی صدی میں اس علاقے میں سونے چاندی کی کانیں تلاش کرنے والوں کا قمار خانہ تھا اور اب ساری دنیا کا

قمار خانہ ہے۔ صد حیف کہ جب جہانِ نو پیدا ہونے کی گھڑی آئی تو شیوخ حرم اپنے کلیسے کر فرنگی مقامروں کی سمت پرواز کر گئے۔

سنہری لڑکیاں انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں اور ریشمی آوازوں میں اعلانات کر رہی ہیں ــــ لاس اینجلز کا ایک ہسپانوی نژاد امریکن ٹی۔وی اسٹار کھڑکی سے باہر شفق کو دیکھ رہا ہے یہی سورج چھ سو برس قبل اسلامی اُندلس کے مدینہ الزہرا پر ڈوب کر اس بانکے ایکٹر کے اجداد پر اس وقت طلوع ہُوا تھا جب وہ نئی دنیا کے مغربی ساحل پر الحمرا اور مدینہ المریم ملکہ الملائکہ۔ ایل ہیلبودی، نیوترا سینورا لا رینا دی لاس اینجلز آباد کر رہے تھے، تب سے یہ سورج یہیں چمک رہا ہے۔

"مور کی آخری آہ"

اسپین میں وہ مقام جہاں آخری شاہ غرناطہ ابو عبداللہ اپنی شکست کے بعد کھڑا ہو کر رویا تھا، "مور کی آخری آہ" کہلاتی ہے۔ "لوک ہارٹ" نے اپنے "اسپینش بیلیڈ" میں لکھا:-

"بوعبدل نے غرناطہ کی کنجیاں فرڈی ننڈ کو تھمائیں اور اپنے شہر پر الوداعی نگاہ کی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر کوہستان کی سمت چلا گیا۔ اس پہاڑی پر پہنچ کر اس نے اپنی سلطنت پر نظر ڈالی جسے وہ کھو چکا تھا "اللہ اکبر"۔ اس نے آہ بھری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ماں عائشہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے کہا" تم عورتوں کی طرح رو سکتے ہو کیونکہ تم مردوں کی طرح لڑ نہ سکے"۔

جب سورج ڈوب رہا تھا، غرناطہ میں لوگ روئے۔ کچھ نے تثلیث کو پکارا۔ کچھ نے محمدؐ کو۔ قرآن یہاں سے چلا گیا۔ صلیب آگئی۔ گرجاؤں میں گھنٹیاں بجیں۔ الحمراء کے میناروں سے ہلال نوچ کر پھینک دیئے گئے۔ ایک بادشاہ ظفر مند آتا ہے۔ ایک سلطان روتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ گریہ کناں اپنی سفید داڑھی نوچتا نوحہ زن ہے۔ الوداع غرناطہ! الوداع بے مثال شہر! رخصت اے فخرِ جہاں۔ سات سو سال تو نے ایک مغرور توانا بلند مرتبت نسل کی پرورش کی۔ اعلیٰ نسب شاہی خاندان تیرے

محلات میں بسنے اب جاتے ہیں۔ دلاور سُورما تیری گلیوں میں پھرے جو مسیحیوں سے لڑتے تھے اور حسیناؤں کی خاطر اور اپنے رسولؐ کی خاطر اور اپنی سلطنت کی حجازی امیدوں کے گھر جا کے دیکھو وغیرہ کی خاطر تیغ زنی کرتے تھے۔ صد حیف کہ تیرے باغات اور آبشاروں اور مرغزاروں کا حسن گہنا گیا۔

واحسرتا ـــ واحسرتا ـــ

بوعبدل افریقہ چلا گیا جہاں اس کی اولاد نے بھیک مانگی جس طرح سات سو سال بعد مغلوں کی اولاد دلی میں بھیک مانگنے والی تھی۔ بقائے اصلح کا قانون اٹل ہے۔

اس الحمراء کے ایوانِ سفراء میں جس کے زریں تخت پر چند روز قبل تک خلفائے اندلس جلوہ گر ہوئے تھے، سن چودہ سو نوے عیسوی میں ایک صبح ملکہ ازابل متمکن تھی اور ڈون کرسٹفر اس کے سامنے دو زانو جھکا نئی دنیائیں تلاش کرکے" ملکہ کے تاج میں ایک اور ہیرا جڑنے" کی درخواست پیش کر رہا تھا۔ زردوزی کے کلمہ طیبہ سے مزین خلفائے اندلس کا سرخ بیضوی پرچم سرنگوں ہوا۔ ڈون کرسٹفر نیا بیضوی صلیبی پھریرا جہاز پہ لے کر۔ اس کے پورے دس سال بعد پرتگالی جھنڈا لہراتا بادبانی جہاز پر اطالوی مہم جو سینور امریگو ـــ برازیل کے ساحل پر ـــ

اب ذرا قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھو۔

اگر ہسپانیہ کی مختلف مسلمان ریاستوں کے حکمراں بری طرح آپس میں لڑکر کمزور نہ پڑتے اور آخر میں عیسائیوں سے مغلوب نہ ہوتے تو کیا خود نئی دنیاؤں کی تلاش میں نہ نکل سکتے تھے۔ مگر خداوند تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ مولانا حالی مسدس اور علامہ اقبال شکوہ لکھیں۔

ایک ہسپانوی فادر ٹہلتا ہوا واپس آ کر تی ۔ وی اسٹار کے نزدیک کرسی پر آ کر بیٹھا۔ اور تسبیح پھیرنے میں مصروف ہوا۔

سنو! بے شمار شکست خوردہ اندلسیوں کو جبراً اصطباغ دیا گیا تھا۔ غرناطہ کیتھڈرل کے شاہی چیپل میں الطار کے پیچھے دیوار پر ایک بڑی چوبی ابھری ہوئی رنگین تصویر میں (جو زوالِ غرناطہ کے چوبیس سال بعد تیار کی گئی تھی) اگرجا میں حوض کے گرد جمع اندلسی مردوں اور عورتوں کو پادری بپتسمہ دے رہے ہیں۔ نئی عیسائی حکومت نے تمام مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ باقی یورپینوں کی طرح نہانا ترک کر دیں۔

۱۵۶۷ء میں فلپ دوئم نے الحمرا کے تمام حمام توڑ ڈالے کہ مفتوح مسلمان نہانے سے باز آئیں۔ زوالِ غرناطہ کے بعد وہ بے چارے ناکام گوریلا لڑائیاں لڑتے پھرے۔ مارے گئے۔ مراکش جلاوطن ہوئے۔ باقی ماندہ کو زبردستی بپتسمہ دیا گیا اور وہ مسیحی آبادی میں مدغم ہو گئے۔

مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک ہسپانیہ کو یورپ کا دانش کدہ اور زرخیز ترین ملک بنائے رکھا۔ ان کے خاتمے کے بعد اندلس ایک بار پھر صحرا میں تبدیل ہوا۔ نہریں اور کھیت خشک۔ مدارس ویران۔ نئے مفلوک الحال عیسائی ہسپانوی قسمت آزمائی کے لئے سمندروں پر نکلے۔ بہت جلد بحیثیت ایک بد دماغ بے رحم امپیریل بحری طاقت اپنے عرب ورثے کا غرور اور بانکپن اور موسیقی اور مورش طرزِ تعمیر ساتھ لئے وہ دنیا پر چھا گئے۔ مشرق میں گوا، اور فلپائن۔ شمالی امریکہ میں مغربی صحرا، کیلی فورنیا، میکسیکو، جزائر غرب الہند، سارا جنوبی امریکہ ـــــ

سیاہ چشم تی۔ وی اسٹار اور میڈرڈ سے آنے والا ہسپانوی

اور دونوں اپنے اس عرب ورثے سے لاعلم اور بے نیاز ہیں۔ عرب
بیج اس وقت یہ قمار باز پٹرو ڈالر پتی اور چوچخ نما نقاب پہنے ان کے
یم کی عورتیں دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

گلِ آفتاب

اسپینش فادر کے عقب میں ایک فربہ اطالوی بیٹھا ہے (اس کی
قوم نے مارٹن لوتھر پیدا کیا تھا) اس کے ہاتھ میں ایک جرمن رسالہ ہے
اور رسالے کے سرورق پر ایک دوسرے درجے کی طاقت برطانیہ کی شہزا
مارگریٹ اپنی عمر سے سترہ سال چھوٹے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک کشتی ک
ڈیک پر شمس خوری میں مصروف۔

مارگریٹ کی طلاق پر تہلکہ نہیں مچتا۔ ہنری ہشتم نے بسلسلہ شادی و طلا
پاپائے روم سے ”کٹی“ کر کے اپنا ڈیڑھ اینچ کا گرجا الگ بنا لیا تھا تو سارے
یورپ میں ذہنی زلزلہ آ گیا۔ کیتھولک چرچ کی زیادتیوں کے خلاف پروٹسٹنٹ
یعنی پروٹسٹ کرنے والے انگریز کیتھولک ہسپانیہ کو بحری شکست دے کر
دنیا کو مسخر کرنے نکلے۔ المانوی شورش اصلاحِ دین کے مفید نتائج سے
ہو کر ولندیزیوں نے کشور کشائی شروع کی۔ پروٹسٹنٹ مذہب نے ورک ای
سخت کوشی، محنت، ضمیر پرستی اور فرد کی آزادی پر زور دیا نشاۃ ثانیہ کی ولولہ خیز
پروٹسٹنٹ ورک ایتھک۔ نیا ذوق تجسس۔ عقلیت پرستی چنانچہ دا

جدید ایلزبیتھ اوّل کے وفادار امیر سر والٹر ریلے نے امریکہ میں برطانیہ کی پہلی نوآبادی ۱۶۰۷ء میں اپنی ورجن کوئن کے نام پر ورجینیا آباد کی تھی۔ عہدِ ایلزبیتھ میں برطانوی پارلیمنٹ کی مذہبی اصلاحات کو ناکافی سمجھنے والے PURITAN لوگ مذہبی بدعتوں کے مکمل خاتمے کے خواہاں۔ گویا وہابی۔ لہٰذا کاؤنٹرز ریفارمیشن کے مظالم سے عاجز آکر رائے حصولِ آزادیٔ افکار وضمیر ایک سو دو پروٹسٹنٹ مہاجر ۱۶۲۰ء میں بروز ۵ اگست مے فلاور نامی جہاز پر (مے فلاور انگریزی میں گلِ آفتاب کا نام ہے اور انگلش موسمِ بہار میں کھلتا ہے) پینسٹھ (۶۵) دن بعد بروز ۲۱ ستمبر امریکہ کا سرسبز مشرقی ساحل۔ امریکن خزاں کے شاندار رنگوں سے معمور اور سُرخ فام اصلی امریکن اپنی جنت میں بیٹھے مزے سے تمباکو کا دھواں اُڑا رہے تھے۔

سفید دیو جہاں پہنچا نیٹو برباد ہوئے۔ چین، سارا مشرق۔ سارا امریکہ۔ اور وہ سترہویں صدی تھی۔ اور سفید ساحر ساری دنیا پر اپنا منتر پھونکنے نکلا تھا۔

گو اس کشتی پر سوار اصول پرست انگریزوں نے آزادیٔ ضمیر کی خاطر وطنِ عزیز ترک کیا۔ مے فلاور کے یہ مسافر پلگرم فادر کہلائے۔ نیٹو "ریڈ انڈین" کہ ہر اسکول کا بچہ جانتا ہے۔ ڈون کرسٹفر کولمبس انڈیا کی تلاش میں۔ امریکہ جا پہنچا تھا اور وہاں کی آبادی کو "انڈین" سمجھا تھا۔

یہ وہابی پلگرم فادر اپنے ساتھ کنگ جیمز بائیبل لائے تھے جو پروٹسٹنٹ انجیل نو سال قبل چھپی تھی۔ جرمنی کے مارٹن لوتھر نے مذہب کو کیتھولک پاپائے روم اور پادریوں کے شکنجے سے آزاد کرایا تھا۔ چرچ میں عبادت پُراسرار مذہبی رسوم کی ادائیگی پر مبنی تھی۔ سادگی پسند پروٹسٹنٹ مذہب میں منبر پر کھڑا اخلاقیات کا درس دینے والا واعظ اہم قرار پایا۔ (بلی گراہم اسی پروٹسٹنٹ روایت کی دین ہے اور بلی گراہم صرف امریکہ میں پیدا ہو سکتا تھا)

کنگ جیمز بائیبل بہت جلد انگریزی ادب کا سنگِ میل بنی۔ جب پلگرم فادر امریکہ پہنچے ولیم شیکسپیئر کی وفات کو صرف چار سال ہوئے تھے۔" اسی دوسرے باغِ عدن نصف فردوس" انگلستان میں آمریت پسند چارلس اوّل کے وفاداروں اور جمہوریت پسندوں کی خانہ جنگی کے دوران مزید جمہوریت پسندوں نے امریکہ پہنچ کر نیو انگلینڈ بسایا۔

سترہویں صدی کے نصف اوّل کی کیتھولک پروٹسٹنٹ جنگوں میں کام آنے سے بچنے کے لیے جوق در جوق اہلِ یورپ شمالی امریکہ پہنچا۔

سترہویں صدی میں یورپ اور انگلستان کے باشندے اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے تھے۔ لیس کے بیحد چوڑے کالروں اور کفوں والے جھال پال کوٹ۔ بیحد وسیع چھجّوں کی ٹوپیاں۔ کمال یہ ہے کہ اس قدر مفصل کپڑے پہن کر یہ لوگ کسی ذوق و شوق سے بے تکان لڑتے تھے۔ جہانِ تازہ ڈسکور کرتے تھے اور سائنس کی ایجادات کرنے میں جُٹے تھے۔ فرانس اور انگلستان والے امریکہ میں نوآبادیاں قائم کرنے والے ایک دوسرے سے بھڑ رہے تھے۔ غرضیکہ بڑی رونق کا زمانہ تھا۔ اہلِ فرانس نے کینیڈا آ کیا اور وہاں سے ذرا نیچے آکر۔ CREAF LAKES کا سارا علاقہ جہاں سے مسی سپی دریا شروع ہوتا ہے۔ اس دریا پر جہاز رانی کرتے وہ جنوب تک جا پہنچے۔ وہاں لوزیانا کی ریاست اور شہر نیو اورلینز بسایا۔ شمال مغرب میں ولندیزیوں نے نیو ایمسٹرڈم آباد کیا جو بعد میں انگریزوں نے چھین کر اس کا نام نیو یارک کر دیا۔ اور سب نے مل کر لال بھارتیوں کا بھرتہ بنایا جو ہسپانیوں کے ہاتھوں مارے جلنے سے بچ رہے تھے۔ اہلِ ہسپانیہ میکسیکو کی قدیم تہذیب بالکل نیست و نابود کر دی تھی جس طرح وہ کچھ عرصہ قبل اُند کو نابود کر کے آئے تھے۔

انتہائی زرخیز زمین، گھنے جنگلات، معدنیات، ہزاروں میل لمبے دریا، شاداب مرغزار متنوع قدرتی ذخائر اور ان کو کام میں لانے اور ترقی دینے والے جفاکش مہاجرین۔ شمالی ا

کی بیرہ برطانوی نوآبادیوں کی دولت تیزی سے بڑھی۔ یورپ کی لڑائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لیے انگلستان نے اپنی متمول امریکن نوآبادیوں پر مزید ٹیکس لگائے۔ چائے پر محصول عائد کیا، تو انگریز نژاد امریکنوں نے بھنا کر ساری چائے بوسٹن کی بندرگاہ میں پھینک دی تو دیکھو کہ چائے کی پیالی سے طوفان اُٹھا اور امریکن جنگِ آزادی شروع ہوئی اور ۱۹ راکتوبر ۱۷۸۱ء کے روز انگریز جنرل کارنواس نے ہتھیار ڈالے ۔ مگر یہ بھی دیکھو اور عبرت پکڑو کہ عین اسی زمانے جب برطانیہ نے امریکہ کھویا، ایسٹ کمپنی کا سُرخ صلیب اور سُرخ و سفید دھاریوں والا پرچم اہلِ ہند کی نااہلی اور نفاق کے سبب سرزمینِ ہند میں نصب کیا۔ ٹیپو، جنرل واشنگٹن وغیرہم سے زیادہ جری تھا مگر مرہٹے تو خیر مرہٹے تھے خود نظامِ دکن اس کے خلاف انگریزوں سے جا ملے۔

اور یہ بھی دیکھو کہ پروٹسٹنٹ مشنری اسپرٹ اور واعظ کے تبلیغی جوش سے سرشار بائیبل سنبھالے امریکن مرد اور عورتیں چند سال کے اندر اندر اوائل انیسویں صدی میں اسکول اور میڈیکل کالج قائم کرنے برطانوی ہند پہنچنے لگے۔

امریکن انقلاب فرنچ انقلاب کا پیشرو تھا۔ "آزادی۔ مساوات اور اخوت" اور امریکن تمول کے چرچے یورپ میں شروع ہو چکے تھے۔ زار شاہی روس اور پولینڈ کے مظلوم یہودی، مفلس سسلی اور آئرلینڈ اور یونان اور البانیہ کے کسان، سارے پریشان حال یورپ کے غربا اور مساکین، یا ایڈونچر کے خواہاں، یا جرائم پیشہ بدمعاش، اور ان کے علاوہ دانشور، اصول پسند، سیاسی آئیڈیلسٹ، ضمیر پرست، سبھی انیسویں صدی میں "بہترین مواقع کی سرزمین" کا رُخ کرتے ہیں۔ ایک انگریز آرٹسٹ فورڈ میڈوکس براؤن دلدوز تصویر بناتا ہے۔ ہوا کے تھپیڑوں کے مقابل ایک اداس انگریز کنبہ کشتی میں بیٹھا دُور کی سفید چٹانوں کو آخری بار دیکھ رہا ہے اور بیسویں صدی میں آمریت اور فسطائیت اور نازیوں سے پناہ لینے کے لیے

یورپ کے دانشور اور سائنسداں بالخصوص امتِ موسےؑ[۱۴] کے جرمن اہلِ علم وفضل ایک اور دلدوز تصویر ہے کہ البرٹ آئن سٹائن۔ سر پہ چھبّا سفید بال۔ معصوم سوئٹ چہرہ، داہنا ہاتھ اٹھائے حلف وفاداری لے رہے ہیں۔ (میں نے اس آواز دینے والے کو دیکھنے کے لئے منہ پھیرا۔ اس کے سر کے بال سفید اون بلکہ برف کی مانند سفید تھے۔ یوحنا عارف نے کہا)

خداوند خدا نے انجیل مقدس میں فرمایا۔

"میں اس زندگی کے درخت میں سے جو خدا کے فردوس میں ہے پھل کھانے کو دوں گا" ___ گوڈز اون کنٹری۔

لیکن حبشیوں کے لیے نہیں۔

یوحنّا نے اپنے مکاشفے میں دیکھا اور اس تخت کے سامنے آگ کے سات چراغ جل رہے ہیں اور اس کے سامنے گویا شیشے کا سمندر بلور کی مانند ہے اور تخت کے بیچ میں اور تخت کے گرداگرد چار جاندار ہیں اور چوتھا اڑتے ہوئے عقاب کے مانند ہے اور ان چاروں کے چھ چھ پر ہیں اور چاروں طرف اور اندر آنکھیں ہی آنکھیں اور جب میں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان پر ایک عقاب کو اڑتے دیکھا اور بڑی آواز سے یہ کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آواز کے سبب سے جن کا پھونکنا ابھی باقی ہے۔ زمین پر رہنے والوں پر

مے فلاور بادبان پھٹپھٹاتا ساحل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک پلگرم فادر نے اپنی نئی نویلی پروٹسٹنٹ انجیل میں یوحنّا کے مکاشفے کی تلاوت کرتے کرتے آسمان پر نظر ڈالی۔ اس امید پر کہ شاید ان زرد پہلے بادلوں پر سوار مسیح ناصری ابھی واپس آتا ہو، وعدے کے مطابق ___ لیکن آسمان پر ساحلی پرندے اڑ رہے تھے اور آئن سٹائن ابھی غیب میں تھے۔

تب مَیں نے نیچے اُترتے ہوئے اٹرن ہاتھی پر سے سمندر کی طرف نگاہ کی جہاں فلک شگاف شہر نیو یارک دُور دُور تک پھیلا تھا اور اونچے پلوں کے نیچے سے جہاز گذر رہے تھے۔ اور بندرگاہوں میں ہزار ہا بادبانی ڈونگیاں اور موٹر کشتیاں جگمگا رہی تھیں۔ دھندلکے میں مجسمۂ آزادی ایک بار چمکا۔ مسافروں نے موسیقی کے سماعت کے آلے کانوں سے علیحدہ کیے۔ کانوں میں نرسنگے کا پھونکا جانا ابھی باقی ہے۔

ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آواز جن کا پھونکا جانا ابھی باقی ہے۔ اس زمین کے رہنے والوں پر افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔

پہلا افسوس: مسیح ناصری کی دوبارہ آمد کے منتظر اور ظہور امام مہدی آخرالزماںؑ کے منتظر اس زمین کے باسیوں کے درمیان عنقریب صلیب وہلال کی معرکہ آرائی شروع ہونے والی ہے۔

دوسرا افسوس: جنوبی اصطباغی دیندار خدا پرست عیسائی صدر جمہوریت اور مادیت پرست روس کے مابین سرد جنگ کا آغاز۔

تیسرا افسوس: آلِ اسمٰعیل اور آلِ اسحٰق کے بیچ خونریزی بدستور جاری ہے۔ الاماں۔ الاماں۔ الاماں۔

تب کینیڈی ایرپورٹ سے لاگارڈیا کے لیے ٹیکسی میں سوار کراتے ہوئے موٹے سادہ مزاج امریکی افسر نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ "پولیش رائٹرز کا پلین وارسا سے چند منٹ میں پہنچنے والا ہے اب مجھے ان کا استقبال کرنا ہے۔" گو یہ آمدورفت مک آرتھی کے دور میں ممکن نہ تھی۔ لیکن ساری دنیا ایک بار پھر تلوار کی دھار پر سے گذرنے والی ہے۔

"اب تو ہمارا پوپ بھی پولش ہے!" موٹے افسر نے لفظ پوپ ادا کرتے ہوئے تعظیماً ہاتھ جوڑے۔ دغالباً نیو یارک آئرلش تھا۔

مغرب میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ لڑائیاں خواب وخیال ہوئیں (آئرلینڈ کا قصہ دوسرا ہے کہ وہاں نہ ریفارمیشن آیا نہ صنعتی انقلاب) چار سو سال قبل جیزوئیٹ فادر لالولا نے یورپ میں اینٹی ریفارمیشن تحریک چلائی تھی۔ سارے برِاعظم میں ہزارہا پروٹسٹنٹوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ آج سارے مغرب میں (مع امریکہ) اس کیتھولک رہنما کے نام پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ پروٹسٹنٹ ان کے سامنے دھرنا نہیں دیتے کہ یونیورسٹی کا نام بدلو۔ لیکن ہمارے ہاں ہندو مسلم شیعہ سُنّی فسادات کیوں نہ جاری رہیں۔ ہم کوئی بے حیا۔ بے دین مغربی تھوڑا ہی ہیں۔

نسکا گو کیتھولک آئرش پولستانیوں ہسپانیوں وغیرہ کا دوسرا بڑا شہر اور دنیا کا مصروف ترین ایرپورٹ جہاں ہر ایک منٹ پر ایک طیارہ اُترتا اور ایک پرواز کرتا ہے، وقفے وقفے سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جا رہا ہے " ایک مذہبی ٹولی صدر دروازے کے باہر مسافروں سے چندہ وصول کرنے کے لیے مستعد ہے۔ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اس طیران گاہ کا ان چندہ بٹورنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے "!

چندہ بٹورنے والے ہرے کرشنا ہرے راما" کے امریکن لڑکے لڑکیاں گیروا دھوتیاں اور ساریاں پہنے باہر بے نکان کیرتن گا رہے ہیں جہاں کنکریٹ کے میلوں طویل پیچدار پُلوں والے مسقف کار پارک کے اندر کھڑی ہزار ہا کاروں سے اُتر کر بڑھیا کپڑے پہنے بڑھیا سوٹ کیس سنبھالے ہزاروں ہزار مسافر خاموشی سے اندر جا کر ایرپورٹ کی قالینوں سے آراستہ فرلانگوں، طویل راہداریوں سے گزرتا جھلملاتی پُرتکلف لاؤنجوں اور ریستورانوں میں انتظار کرتا، کمپیوٹرز پر طیاروں کی آمد ورفت کے اوقات دیکھتا۔ سُرخ قالینوں سے آراستہ امیر جیٹی کی مسقف گیلریوں کے دروازوں سے جٹ طیاروں پر سوار ہو ہو کر سارے ملک کی عین بین اسی قسم کی دوسری طیران گاہوں کی طرف جانے میں مصروف ہے۔ وہ دھوتی پوش نوجوان اس اشیاء پرست ٹیکنولوجی کل معاشرے کو مسترد کر کے بندرا ان فینیٹی سے مسحور

ایسی طیران گاہوں سے اُڑ کر ہزاروں میل دُور متھرا ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے، وہاں کے افلاس، بھکاریوں، غلاظتوں، غل غباڑے گرمی بندروں، ہانپتے ہوئے فاقہ کش قلیوں، پلاسٹک کے بھدّے کھلونے، بیچتے غریب خوانچہ فروشوں، غربت زدہ نحیف لاغر، فرسٹریٹیڈ مسافروں سے کھچا کھچ بھری بدبو دار ٹرینوں کی ساری مادی حقیقت کو یکسر نظر انداز کر کے مہامنتر جپتے وہ نوجوان امریکن بندرا بن جا رہے تھے۔

جبکہ کرشنا کے دُکھی فلاکت زدہ دیس کے باسی امریکہ کے سپنے دیکھ رہے ہیں۔ ٹرینیں امریکہ میں تقریباً عنقا ہو گئی ہیں۔ ساری آبادی بذریعہ ہوا اور کار رواں ہے۔ شکاگو سے تیسرا طیارہ برائے سیڈر ریپڈ امریکن مڈ ویسٹ۔ اُفق تا اُفق پھیلی جھیلیں بھٹے کے زرد کھیت۔ سپاٹ میدان۔ دریا۔ جنگل۔

سیڈر ریپڈز کی چھوٹی سی طیران گاہ کے گورے ہجوم میں صرف ایک سانولا آدمی نظر آیا سر پہ جھبّوا بال۔ ستواں ناک۔ ذہین چہرہ۔ ساتھ جینز میں ملبوس ایک سانولی نوعمر لڑکی۔ وہ افریقی چھپائی کے کُرتے میں ملبوس تھا مگر اپنے جھبّوا بالوں کے باوجود بلیک امریکن یا مخلوط النسل امریکن یا افریقی معلوم نہ ہوتا تھا۔

اس نے کہا۔ "میرا نام پیٹر ناصرۃ ہے۔ میری لڑکی کیتھرین۔ آیوواسٹی سے آپ کو لینے آیا ہوں۔ آئی۔ڈبلیو۔پی کے اسٹاف پر ہوں اور یونیورسٹی میں جدید افریقی ادب پڑھاتا ہوں۔ آپ کو انگریزی میں کافی پڑھا ہے اور آپ کے متعلق کلاس میں لیکچر بھی دیئے ہیں۔"

"لیکن تم بلیک امریکن تو نہیں لگتے۔"

"یوگنڈا کا رہنے والا ہوں۔"

"تم افریقی بھی نہیں لگتے۔ شکلاً ہندوستانی معلوم ہوتے ہو۔"

"میرے والد گوا سے یوگنڈا چلے گئے تھے۔ ۶۱ء میں مَیں انگلستان گیا۔ مَیں اور میری بیوی برطانوی شہری ہیں۔ عیدی امین کی وجہ سے یوگنڈا واپس نہ جا سکے۔ یہاں آ گئے۔ یوگنڈا کے متعلق میرے دو سیاسی ناول یہاں سے شائع ہو چکے ہیں۔"

گھُپ اندھیری رات میں پیٹر کار ایکسپریس وے پر لے آیا۔ بے حد طویل جہازی فولادی مال بردار ٹرک ان گنت سُرخ بتیوں سے معمور مبادا اندھیرے میں کاریں ان سے ٹکرا نہ جائیں، زائیں زائیں برابر سے گذر رہے تھے۔ تیس میل بعد آیو واسٹی کی روشنیاں

ان گھپ اندھیری راتوں میں تین چار سو سال پہلے فرانسیسی نوآبادکار اپنی ویگنوں پر تجارت کا مال لادے لشٹم پشٹم چرخ چوں اپنی ایک ٹریڈنگ پوسٹ سے دوسری کی طرف جا رہے ہیں۔ سُرخ ہندوستانیوں کے خیموں میں پہنچ کر ان سے لین دین میں مصروف ہیں اور ان سے یہ زمینیں بھی چھین رہے ہیں۔ (آیو وا بھی ریڈ انڈین نام ہے)۔

آیو وانڈی کے نزدیک نارتھ دو بیُوک اسٹریٹ۔ اواخر اٹھارویں صدی میں جُولین دو بیُوک فرانسیسی نے مزید علاقے سُرخ فام قبائل سے حاصل کر کے جستے کی کانیں دریافت کی تھیں۔ پل پل چھن چھن اہلِ مغرب ساری دنیا پر چھائے جا رہے ہیں۔

شاہراہ نارتھ دو بیُوک پر سے زنّاٹے سے کاریں گذرتی جاتی ہیں۔ اس کے کنارے پارک کے مقابل مے فلاور اپارٹمنٹس کی پلیٹ گلاس بیرونی صدر دروازے کے نزدیک گلِ آفتاب کی تصویر۔ عمارت کے کونے پر پیٹر کے گراؤنڈ فلور فلیٹ کے اندر خلیق میری خوش مزاج ناصرت کھانا پکانے میں مصروف۔ چہرے پر شرارت۔ اس کے والدین گوا سے تنزانیہ چلے گئے تھے۔

ٹیلی فون پر بات کر کے پیٹر نے مجھ سے کہا۔" شاڈشن۔ پیکنگ سے کل صبح پہنچ رہے ہیں۔" مَیں نے میز پر رکھے اخباروں پر نظر ڈالی۔ ۱۷ر اگست کے ضخیم نیویارک ٹائمز کے ایک صفحہ پر پال اینگل کی تصویر کے نیچے لکھا تھا۔"مارک ٹوئن

کے دریا پر مارکسسٹ اور غیر مارکسسٹ چینیوں کی دعوت۔ آیوا سٹی کے مشہور انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام میں چینیوں کے علاوہ اس سال اسرائیل، جورڈن، مصر، کولمبیا، ہندوستان، آئرلینڈ، ہنگری، پولینڈ، اسپین "اور ہسپانوی، پرتگالی زبانوں میں لکھنے والے جنوبی امریکن ادیب اُندلس کے ادیب اور شاعروں کی ٹریجڈی سے لاعلم اور بے پرواہ۔ بہت بڑا فاصلہ تھا۔ اور پیٹر اور میری نافرت جن کی زبانیں انگریزی اور پرتگالی اور کونکنی تھیں مگر کونکنی وہ بھول چکے تھے۔

چند سال ہوئے کنڑ ادیب یو۔ آر۔ مورتھی نے لکھا تھا! "حیرت ناک بات یہ ہے کہ جدید ہندوستانی ذہن اوریجنل نہیں رہا۔ ہماری ہر چیز مغرب کی نقالی ہے۔ خود اپنی پرانی تہذیب کی جدید کے رویّے کا محرک بھی مغرب ہی تھا۔"

" اور تم لوگ" میں نے کھانا کھاتے ہوئے پیٹر سے کہا "زوالِ غرناطہ کے بعد کی اس مسیحی ہسپانوی توسیع کی یادگار ہو۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے سارا مشرق مغرب کی طرف دیکھ رہا ہے اور اب اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا، وہ جو لطیفہ تھا کہ مہاتما گاندھی مائیکروفون پر قدیم ہندی رام راج اور گاؤں کی غیر مشینی تمدّن کا راگ الاپتے تھے۔ ملا خمینی ٹیلی ویژن پر ساتویں صدی کا پرچار کر رہے ہیں۔ جہد البقاء میں یہ لوگ ہم سے سبقت لے گئے۔ ہم لوگ جذبۂ تجسس کھو چکے تھے۔ یہ لوگ نشاۃ ثانیہ سے لے کر آج تک متحیّر ہیں۔ پیہم سوالات کر رہے ہیں۔ سوچ رہے ہیں اکمہ یدیں لگے ہیں۔ اسی وجہ سے اوریجنل باتیں سوچتے ہیں۔ ہنت نئے مے فلاور پر سوار نئی دنیا کی طرف مسلسل سفر میں ہیں۔"

فون کی گھنٹی پھر بجی۔

مشرق میں ان مغربی ایجادات کا استعمال کرتے ہوئے جن کو یوروپین سامراج نے وہاں متعارف کیا۔ ہم اپنے دل کو خوش کرنے کو قدیم ہندو اور میڈیول عرب

سائنسدانوں کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن پچھلے سات سو سال میں ہم نے کیا ایجاد کیا؟۔

بیٹر میز پر واپس آیا ؎ کل صبح ڈاکٹر نادیا لشائی اسکندریہ سے پہنچ رہی ہیں۔ عربی ان کی مادری زبان ہے مگر انگریزی میں شاعری کرتی ہیں وہی معاملہ کہ تیسری دنیا کا ادیب بیک وقت دو ذہنی کائناتوں میں زندہ ہے۔ مغربی زبانوں میں لکھتے ہوئے کیا اپنے اندرونی شخصی نسلی اور قومی لاشعوری رویئے بدل جاتے ہیں؟"۔

"لیکن شاعری کی تو یونیورسل زبان ہے"

میری بولی۔

"نادیا لشائی قبطی نام معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قبطی۔ عربی۔ انگریزی رویئے۔"

مَیں نے اظہارِ خیال کیا۔

صورِ اسرافیل

ڈاکٹر نادیا یاز کی بشائی کچن کی میز صاف کرتے ہوئے بولیں "لندن یونیورسٹی سے مَیں نے انگریزی شاعری کی میوزیکل بنیادوں پر کام کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کیا۔ اب جامعہ اسکندریہ کے شعبہ انگریزی کی صدر ہوں۔ انگریزی میں نظمیں لکھتی ہوں۔ فرنچ اور ہسپانوی جانتی ہوں۔ میرے علاوہ مصر میں اور کوئی انگریزی میں شاعری نہیں کرتا۔"

"واقعی؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"مَیں کونسرٹ پیانسٹ بھی ہوں۔ دراصل مَیں اپنی کوالی فیکیشنز کے لحاظ سے مصر میں منفرد ہوں۔"

"مصر تو بہت ترقی یافتہ ملک ہے۔ یقیناً تمہاری طرح کی بہت سی خواتین وہاں ہوں گی۔" مَیں نے کہا۔

"نہیں۔" ڈاکٹر بشائی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ "مَیں منفرد ہوں۔"

انکسار عزیزہ نادیا کی کمزوری نہیں تھا۔

مَیں برتن سجانے میں منہمک رہی۔ میرا اور اس غیر معمولی قبطی خاتون کا مشترکہ

باورچی خانہ ہمارے کمروں کے وسط میں واقع تھا ۔ مے فلاور کی مختلف منزلوں پر بالکل اسی طرح کے دوہرے اپارٹمنٹس میں ساری دنیا کے ادیب سیڈر ریپڈز سے آآکر سیٹل ہونے میں مصروف تھے ۔

"مصر میں کتنے قبطی ہوں گے ؟" میں نے دریافت کیا۔

"آبادی کا بہت بڑا تناسب ہے لیکن مردم شماری میں ان کی تعداد بہت قلیل بتائی جاتی ہے" نادیا نے جھنجھلا کر جواب دیا ۔ "بہت سے قبطی ان ہی وجوہات کی بنا پر مصر سے ہجرت کر رہے ہیں"۔ ایک مذہبی اقلیتی فرقے کی نفسیات اور مسائل یہ ایک ملک میں یکساں ہیں ۔

نادیا نے سالن تلنے کے لئے کڑھائی چولہے پر رکھی اور اپنے کمرے میں گئی ۔ میں اپنے بیڈ روم میں آکر دریچے سے باہر دیکھنے لگی جہاں پارک لینڈ میں سے گذرتی دریائے مسی سپی کی شاخ آیوا ندی کے پل پر یونیورسٹی کی فری بسیں آآکر رُک رہی تھیں ۔

اچانک میرے کمرے میں دیوار میں نصب ٹیلی فون کے اوپر لگے ایک لاؤڈ اسپیکر میں زوردار سائرن سا بجنے لگا ۔ میں نے اس لاؤڈ اسپیکر کو اب تک نہ دیکھا تھا ۔ سوچا شاید اندرونی ریڈیو سسٹم ہے ۔ خراب ہوگیا ہے ۔

صورِ اسرافیل چند منٹ تک بجا کیا پھر آپ سے آپ بند ہوگیا ۔ کچھ دیر بعد میں اخبار لانے کے لئے (جو ساری عمارت کے کرائے داروں کے لیے مفت رکھے ملتے تھے) نیچے جارہی تھی ۔ لفٹ میں ایگنیس مل گئیں ۔ ایگنیس ہنگمری کی مشہور شاعرہ تھیں ۔ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی پلیٹینم بلونڈ بہت پریشان نظر آتی تھیں کہنے لگیں "کیا تمہارے بیڈ روم میں بھی ایکدم زور کا بھونپو بجنے لگا ہے ؟"

"جی ہاں"۔ میں نے جواب دیا"کیا سی۔آئی۔اے نے یہ فلیٹ ٹیپ تو نہیں کر رکھے ہیں"

ایگنیس ہرگز نہ ہنسیں۔ سنجیدگی سے بولیں "میں ابھی کھانا پکا رہی تھی۔ زور سے بھونپو بجا۔ میں نیچے عمارت کے دفتر میں پوچھنے گئی کہ یہ کا ہے کا الارم سسٹم ہے۔ انہوں نے بتایا SMOKE DETECTOR چولہے پر کوئی چیز ذرا سی بھی جلنے لگے۔ فوراً بجتا ہے۔ تب چولہے پر لگا اَن دیکھا پنکھا چلا دینا چاہیئے۔ اور سُنو یہ ان دیکھا پنکھا تو غسل خانے کا دروازہ کھولتے ہی آپ سے آپ چلنے لگتا ہے۔ اور کچن کی چلمچی میں سارا کچرا ڈال کر ایک بٹن دباؤ گھڑ گھڑ سارا کچرا غائب۔ کل صبح میری ناظرت مجھے یہ سب سمجھا گئی تھی۔ مگر یہ دھوئیں کا بھونپوا سے یاد نہ رہا۔ اس قدر ٹیکنولوجی۔ حد ہے"

"صورِ اسرافیل" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"قربِ قیامت کے آثار۔۔۔ لیکن سوشلسٹ ملکوں میں تو قیامت آنے کی ہی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ہائی فوکس HI FOLKS" تیسری منزل پر لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے انڈوایگزیٹریا کے ہنس مکھ ارشوبندو نے میری بات کاٹی۔ تین دن میں وہ بے حد امریکن ہو چکا تھا۔

میپل کا درخت

"میں سیڈر ریپڈ کے ایک جرمن نژاد کسان گھرانے میں پیدا ہوا تھا" پال اینگل نے کہا۔

"کالونسٹ کیا مطلب؟" ارشوینددو نے دریافت کیا۔

"جان کالون سولہویں صدی فرانس کا ایک پروٹسٹنٹ ریفارمر تھا۔ اس نے محنت اور عمل پسندی پر زور دیا تھا۔ یہ ساری زراعتی بائبل بیلٹ ہم جیسے لوگوں سے آباد تھی۔ مذہب، قدامت پرست محنتی، بات کے کھرے اور اصول پسند اور جمہوری۔ میرے والد گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ گاڑی میں جُتنے والے گھوڑے، بار برداری اور شہسواری کے گھوڑے۔ امیر اچیا لیس کے گھوڑے بیچتا تھا۔ میں گھوڑوں کی اس دنیا میں پروان چڑھا۔ جب آٹوموبیل کی دنیا ابھی نوزائیدہ تھی۔

"لڑکپن میں صبح صبح میں اپنے باپ کے دو ویگن تنہا ہانک کر ٹیلی فون کمپنی لے جاتا۔ راستے میں ریل کی پٹڑیاں پڑتیں۔ ایک گاڑی بائیں ہاتھ سے ہانکتا اور دوسری دائیں سے۔ جب سامنے سے ٹرینیں گذرتیں مجھے بہت ڈر لگتا۔ کیونکہ اگر اس وقت انجن سیٹی بجاتا تو دونوں گھوڑے بدک جاتے تھے۔ دوپہر کو میں اخبار بیچتا، کر کڑاتے

ڑوں میں گھر گھر جاتا۔

"سیڈر ریپڈز میں ایک پُرانی وضع کا چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ سیڈر ریپڈز
ٹ بیچنے مَیں وہاں بھی جاتا۔ اس ہوٹل میں چند لڑکیاں رہتی تھیں۔ ان کا
ہر کوئی ذریعہ آمدن نہ تھا نہ کوئی مشغلہ یا ملازمت، کیونکہ جب میں اخبار
ے کر وہاں جاتا تو صبح کے ساڑھے دس بجے وہ اپنے اپنے کمروں میں محوِ
اب ہوتیں۔ میں سمجھتا کہ وہ بہت ہی اہم ہستیاں ہوں گی جو بجائے کام
ام کرنے کے دن چڑھے تک پڑی سویا کرتی ہیں!"

"جب میں کالج پہنچا اور رہوڈز وظیفے پر اوکسفرڈ گیا وہاں کی زندگی ہمارے
عتی جمہوری آئیو واسے کس قدر مختلف تھی۔ پُر تکلّف اور طبقاتی درجہ بندیوں
پابند۔ انگلش طبقاتی نظام مجھے بہت عجیب معلوم ہُوا۔ چند سال میں جرمنی
رہا!"

"کرسٹوفر اشروڈ کی جرمنی"، مَیں نے کہا۔

ہیمنگوے، گرٹرڈ اسٹین، ایذرا پاؤنڈ کا یوروپ، امریکن ادیبوں کا
تھ استھان پیرس تھا۔ جبکہ ایلیٹ اپنے آپ کو پکّا انگریز بنا چکے تھے۔
، زمانے کے متعلق کتنا لکھا گیا ہے۔ فلم بنے ہیں۔ ایک پوری دیومالا تیار
چکی ہے۔

کھانے کے کمرے کی دیوار پر وہ پتوار آویزاں تھی جس کے ذریعے نوجوان
اینگل اوکسفورڈ کیمبرج بوٹ ریس میں اپنی ناؤ کھیتے تھے۔

آج کی نسل کا مشہور شاعر مارون بل ۹۷ء کی اس شام "اینگلٹرِ بالکنی" کے
سے ٹکا دوسرے مشہور شاعر اسنوڈ گراس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس
کہ گرٹرڈ اسٹین اور ایلیٹ اور پاؤنڈ ایک موضوع بن چکے تھے۔ پال

انیگل کی نوعمری کے دنوں میں وہ بھی ماروِن بل اور اسنوڈگراس کی طرح اپنی دنیا میں مگن رہے ہوں گے۔ اب وہ جیتے جاگتے انسان نہیں تھے۔ نظریوں اور حوالوں اور مقالوں اور کتابوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

پُرسکون اور خاموش آیوا اسٹی کی اس سنہری شام مے فلاور کے عقب میں ایک ہری بھری پہاڑی پر استادہ پروفیسر پال انیگل کے دو منزلہ مکان کی چوڑی بالکنی میں چھتنار میپل کے نیچے دنیا کے ۲۱ ملکوں سے آئے ہوئے ادیب و شاعر اپنے اپنے وقت میں زندہ اسی طرح غائب ہوتے جائیں گے۔ میپل کا درخت اپنی پتیاں گرا رہا ہے۔ وہ ساری بالکنی پر اُڑتی پھر رہی ہیں۔ لیکن کنیڈا کا قوف گیت "میپل کا پتہ ہمیشہ ہمیشہ بھی صحیح ہے اور ایک ہزار سال قبل اندلس کی مسلمان شاعرہ ولادۃ بنت المستکفی کے سالوں میں اسی طرح ادیبوں کا جمگھٹ ہوتا ہوگا اور اس کی بالکنی کے نیچے کوچہ گرد گوّیتے نغمہ سرا۔ سامنے آیوا ندی پر سورج ڈوب رہا ہے۔

ہسپانیہ بھلائے نہیں بھولتا۔ اسپین کا بالکا نوکیلی مونچھوں والا سانچیز الیسیبو سامنے کی میز پر کولمبیا کی شاعرہ اولگا سے بزبان ہسپانوی مصروفِ گفتگو تھا۔ ڈرائینگ روم کے اندر اسٹیریو پر چینی موسیقی بج رہی تھی۔ نیچے باغ کی سڑک پر چینی سنگی لالٹین نصب تھیں۔ ڈرائینگ روم کی دیوار پر مختلف ملکوں کے ماسک مع کتھاکلی ماسک کے آتشدان کے اوپر مغل پچی کاری کی مرمریں تھالی۔

"یہ تھالی" پال کی چینی بیوی ہوالنگ نے مجھ سے کہا "میں نے آگرے میں دس ہزار روپے میں خریدی تھی جب میں پال کے ساتھ ہندوستان گئی تھی۔ وہاں کی غربت اور سماجی حالات دیکھ کر مجھے انقلاب سے پہلے کا چین یاد آیا۔ میں نے ماؤ کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ مگر میں لکھتی چینی میں ہوں۔ میرے ناول WOMEN OF CHINA کا یہاں سے انگریزی میں ترجمہ شائع ہوگا۔"

"میرے والد " ہوالنگ نے دفعتاً اداس آواز میں کہا۔ "لونگ مارچ کے دوران مارے گئے تھے۔ ۴۷ء میں میں تائیوان چلی آئی۔ ۶۳ء میں پال تائیوان گئے تھے۔ وہاں مجھ سے ملاقات ہوئی۔ ۷۱ء میں ہم نے شادی کی۔"

"ہوالنگ بے حد حسین لڑکی تھی۔" پال بولے۔ "اور جب میں اس سے ملا یہ بحیثیت ناول نگار تائیوان میں مشہور ہو چکی تھی۔ پال ہوالنگ پر عاشق تھے۔ ۳۷ء میں جرمنی سے واپس آکر پال اس یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے لگے۔ پھر اپنے (WRITING CREATIVE) کے کورس کو انہوں نے ۴۱ء میں رائٹرز ورکشاپ میں تبدیل کیا جو ساری دنیا میں مشہور ہوئی۔ شیلورز، ٹینسی ولیمز، فلپ روتھ سیب اسی ورکشاپ سے پڑھ کر نکلے۔ ۶۶ء میں پال ریٹائر ہوئے۔ وہ ورکشاپ اب بھی جاری ہے۔ جب میں امریکہ آئی پال ریٹائر ہونے والے تھے۔ میں نے اسی سال ان سے کہا کیوں نہ ہم لوگ ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال کیا کریں۔ جہاں سارے ملکوں کے ادیب یہاں چھ مہینے اکٹھے رہیں۔ اپنی کتابیں سکون سے لکھیں۔ ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کریں تو کتنے تعصبات زائل ہوں گے۔ پال نے کہا "تم دیوانی ہوا تنے پروگرام کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ میں نے کہا کچھ کر لیں گے۔ تو ہم نے یونیورسٹی سے کہا۔ یونیورسٹی نے کہا اچھا ایک سال ایسا اجتماع کر کے دیکھو۔ تو ہم نے پہلے سال پندرہ رائٹرز بلائے۔ آٹھ ماہ کے لئے۔ اگلے دو سال تک آٹھ مہینے کا پروگرام رکھا۔ بہت زیادہ مہنگا پڑا۔ اسے چار ماہ کا کر دیا۔ تعداد بڑھتی رہی۔ اس سال ۳۷ رائٹرز آئے ہیں۔"

"پیسہ کہاں سے آتا ہے ؟" میں نے دریافت کیا۔

"یونیورسٹی صرف اسٹاف کی تنخواہیں دیتی ہے۔ جنوری میں ہوالنگ اور میں کشکول گدائی لے کر نکلتے ہیں۔ ہر سال کے پروگرام پر ڈھائی لاکھ ڈالر خرچ ہوتا ہے۔ پرائیویٹ مخیروں، فاؤنڈیشنوں اور بڑے تجارتی اداروں سے اور انسٹی ٹیوٹ آف

انٹرنیشنل ایجوکیشن سے چندہ لیتے ہیں۔ صبح سویرے پتہ ہے مَیں کیا کرتا ہوں؟ مَیں امریکہ کی تمام فاؤنڈیشنوں کے ہینڈ بکس پڑھتا ہوں اور ان کو خط لکھتا ہوں۔ بعض دفعہ بہت مایوسی ہوتی ہے اور ذلت بھی محسوس ہوتی ہے۔ پچھلے سال مَیں نے اسّی کارپوریشنوں کو خط لکھے۔ پینسٹھ نے انکار کر دیا۔ پندرہ نے جواب ہی نہیں دیا۔ چند ایک نے چندہ دینے کا وعدہ کیا۔ مگر بارہ سال سے ہم لوگ اسی طرح بھاگ دوڑ کر کے گاڑی چلا رہے ہیں۔ بارہ سال میں دنیا کے چار سو ادیبوں اور شاعروں کو یہاں مدعو کر چکے ہیں۔"

ارجنٹینا کا روڈلفو بانال آ کر بیٹھ گیا۔

"روڈلفو تم بالکل ہالی وڈ فلم کا ساؤتھ امریکن رومیو یا ولین لگتے ہو۔" مَیں نے کہا "کسی طرح ادیب معلوم نہیں ہوتے۔ یا کسی جنوبی امریکن ملک کے انقلابی ہیرو جو کسی منٹ جیب سے پستول نکال کر چلانا شروع کر دے گا۔"

"یہ بالکنی تو اچھی خاصی پیرس کے بائیں ساحل کا کوئی کیفے معلوم ہو رہی ہے۔" نادیا نے اظہارِ خیال کیا۔

مَیں نے نظریں دوڑائیں۔ دریائے سین کا بایاں ساحل اور ادب کا بے حد بایاں بازو ——— رنگ رنگ کے رائٹر اور ان کی بیویاں اس وقت وہاں بیٹھے مصروف اکل و شرب تھے۔ ہنگری کے نوعمر میکلوس ہرزاتی، ایگنیس ناگی اور ان کے شوہر بالاز۔ بلغاریہ کا نینو نکولوف، پولینڈ کے آرٹر نڈزنرکی ——— جولیا ہارٹ وگ، جرزی پرزید اور مائیکل رونی کو۔ یوگوسلاویہ کا میتو جودنسکی۔ مشرقی جرمنی کا وولف گانگ کوہل

"یہ کمیونسٹ ملکوں کے رائٹرز یہاں کیسے آجاتے ہیں" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

پال اینگل نے قہقہہ لگایا۔ موصوف انتہائی خوش مزاج اور زندہ دل بزرگ تھے "مَیں عالمگیر ادبی منظر سے واقف رہتا ہوں اور وہاں کی ادبی تنظیموں سے رابطہ ہے

بانکے روڈلفو نے پھر پوچھا " مگر دوسری زبانوں کے رائٹرز کی اہمیت کے بارے میں کیسے معلوم ہو جاتا ہے ؟"

" پال چھٹی حس کے مالک ہیں " میں نے کہا۔

پال نے قہقہہ لگایا " یہ ایک انوکھا نٹ ورک سا بن گیا ہے۔ بہت سے نام تجویز کیے جاتے ہیں۔ بہت سوں کی چیزیں انگریزی میں بھی چھپ چکی ہیں۔ مثلاً الیسٹریٹیڈ ویکلی میں تمہاری کہانیاں اور مضامین بھی پڑھے تھے لیکن مجھے کوئی جل نہیں دے سکتا !"

مجھے یاد ہے ۷۰ء میں اس پروگرام کے متعلق آپ نے مجھے خط لکھا تھا۔

میں نے جواب دیا " بہت سے ادیب یہاں کافی شک و شبہ کے ساتھ پہنچتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے ملکوں کا پریس سیاسی وجوہ کی بناء پر کافی اینٹی امریکن ہے چار ماہ اس پروگرام کے لئے یہاں رہ کر اصلیت ان پر خود بخود آشکار ہو جاتی ہے۔ اب یہ ایک ایسا کلب بن گیا ہے جہاں باقی دنیا کے رائٹر جنوبی افریقہ کے کالے ادیبوں سے مل پاتے ہیں۔ اسرائیلی اور عرب، کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ اکٹھے رہتے ہیں جب آپ چار ماہ تک ایک عمارت میں رہیئے گا، روز ملیں گے لامحالہ بہت سے تعصبات اور غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ اسی سال پہلی مرتبہ چینی ادیب پیکنگ سے آئے ہیں " پال نے کہا۔

پروفیسر پال اینگل کو ۱۹۷۶ء کے نوبل پیس پرائز کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔

بہت سے لوگ اندر بار پر جمع تھے۔ ایک حسین مغربی خاتون سرخ بال، سبز آنکھیں، کتھئی رنگ کا فراک، ہاتھ میں جام شراب لیے سگریٹ کے کش لگاتی پال کی میز پر آکر بیٹھ گئیں۔

" ہائی لیلے " پال نے خوشدلی سے نعرہ لگایا۔ اور مجھے مخاطب کیا۔ تم ترک

نادلسٹ لیلیٰ اربل سے ملیں؟ یہ آج صبح استانبول سے پہنچی ہیں۔ یہ ترکی کی چھ بہترین ناول نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اور لیلیٰ تم بھی نو موزلم ہونا؟"۔

"محض نام کی مسلمان ہوں۔ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ لیلیٰ نے ذرا رُکھائی سے جواب دیا۔ کمال اتاترک کی تخلیق شدہ ترکی کی خاتون۔ اس کے بعد لیلیٰ خاموش رہیں۔ ان کے چہرے پہ ایک خفیف سی اداسی کی کیفیت طاری تھی۔ ہنگری کی ایگنیس کی سوچتی ہوئی اور اسی کی طرح ۔ڈنر کے دوران یونان کے ارگریس ہیونس عرف آری۔ بلغاریہ کے نیلنوا ور یوگوسلاویہ کے میلتو نے اجو تینوں بیحد ظریف الطبع تھے، لیلیٰ کے سکوت کو توڑنا چاہا۔ طرح طرح سے ان کو ہنسانے کی کوشش کرتے رہے۔ یونان کے آری نے کہا۔"لیلے۔ لیلے تم ہماری سابق آقا ہو لیکن ہم تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں ہم تمہارے سابق غلام ہیں"۔ کچھ دیر بعد وہ چاروں اکٹھے نظر آئے تو پولینڈ کے مائیکل رونی کیٹر نے آواز دی۔" لو صاحب بلقان کانفرنس شروع ہوچکی ہے"۔ مائیکل پولینڈ میں فلموں کے لئے بھی لکھتا تھا اور واژدا کے ساتھ کام کرچکا تھا بے حد طویل القامت تھا۔ اس وجہ سے اسے اب محض پول کہا جارہا تھا۔

اسرائیل کا جل ککڑا سا ادیب اسحٰق اورِ یاتہ جو خود کو لفٹ ونگ کہتا۔ آتشدان کے قریب آکر بیٹھا۔ نادیا قریب سے گذری۔ مائیکل نے اسے پکارا۔ وہ آکر اس گروہ میں شامل ہوئی۔ مائیکل نے اس کا تعارف کرایا۔

"اسحٰق اورِ یاتہ"

"نادیا لبشائی"

دونوں سرد مہری سے مسکرائے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں جاری تھیں۔ کچھ دیر بعد اسحٰق نے نادیا کو مخاطب کیا۔"حال ہی میں مَیں نے اسکندریہ کے متعلق ایک عرب

افسانے کا ترجمہ پڑھا تو مجھے معلوم ہُوا کہ وہاں کی زندگی بھی اتنی شائستہ ہے ؟"۔

"آپ کا خیال کیا تھا ہم لوگ وحشی ہیں ؟" نادیا نے تلخی سے پوچھا۔ "آپ میری دوست ڈاکٹر حسایا کاف مین سے واقف تھے۔؟ چند سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔ شاید وہ یروشلم میں رہتی تھیں"۔ میں نے اخلاقاً بات کی "۔ جانتا تھا۔ جو مر گیا سو مر گیا۔ اب اس کا ذکر بیکار ہے"۔ اسحٰق نے جواب دیا۔ سُنا تھا کہ اسرائیلی بہت کھُرّے ہوتے ہیں۔ مگر یہ تو کمال تھا محی الدین ابن عربی۔

کچھ دیر بعد اچانک اسحٰق نے یہودی فلسفی ربّی موسیٰ ابن میمون کے متعلق مجھ سے نہایت عالمانہ گفتگو شروع کر دی۔ خود ہی بتایا کہ وہ یوکرین سے بارہ سال کی عمر میں فلسطین آگیا تھا ___ عبرانی افسانہ نگار اور تل ابیب کے ایک اخبار کا نیوز اڈیٹر تھا۔

کھانا شروع ہُوا، ڈنر ٹیبل کے سرے پر برازیل کا نوجوان شاعر جولیس سیزر مارٹن دہاڑ رہا تھا۔ "ہم بھی امریکن ہیں مگر امریکن محض یو۔ ایس۔ اے کے باشندوں کو کہا جاتا ہے۔ ہم ساؤتھ امریکن "تیسری دنیا" والے ہیں۔ غریب۔ جذباتی۔ پسماندہ"۔

"اصل، خالص نمائندہ امریکن تو یہاں بھی WASPS ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ وائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ"۔ میں نے کہا۔ "یہ میرا ہاتھ دیکھو"۔ جولیس سیزر نے مکا ہوا میں لہرایا۔ اس کے نام کا پرتگالی تلفظ "ہولیو" تھا ___ تو ہولیو نے گرج کر جواب دیا۔ "میں جیلوں میں رہا ہوں اور مجھے تھرڈ ڈگری کیا گیا ہے۔ اس وقت میں اس شاندار مکان کی اس پُر تکلف دعوت میں شامل ہوں عیش کر رہا ہوں۔ مگر میں اپنی قید خانے کی کوٹھڑی نہیں بھولا۔ وطن واپس جا کر شاید پھر جیل کی ہوا کھاؤں"۔ ہولیو کے بازوؤں پر زخموں کے گہرے نشان نمایاں تھے۔

" اس پروگرام میں" بار کے پاس کھڑے پال اینگل شکاگو کے ایک مشہور رسالے

EAPLE کے نمائندے سے کہہ رہے تھے" بہت سے ادیب ایسے آتے ہیں جنہوں نے اپنے ملکوں میں بہت مصائب جھیلے ہیں۔ سنسر شپ، جیل، مسلسل جدو جہد اور احتجاج ــــ رائٹر خدا کا مخصوص بندہ ہوتا ہے اس لئے تکالیف اُٹھاتا ہے

پال اینگل کی دعوت پر پچھلے سال ۷۰ء کے پروگرام میں ایک ہفتے کے لئے فیض احمد فیض نے بھی شرکت کی تھی جو اس زمانے میں کینیڈا آئے تھے۔ میرے دل میرے مسافر۔ ہُوا پھر سے حکم صادر۔

کھانے کے بعد وہ سکور قص شروع ہُوا۔ نادیا آتشدان کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے ذرا بیزاری سے کہا " سب لوگ لامحالہ سیاسی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ مجھے سیاست سے نفرت ہے۔"

" ہر شخص کے اپنے اپنے تجربات اور رویّے ہوتے ہیں تم کو دلچسپی نہیں نہ سہی۔ تم اپنی خالص شاعری کرتی رہو۔ حالانکہ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تم مصر اور اسرائیل کی جنگوں کے زمانے میں بے ساختہ نظمیں لکھ چکی ہو" مَیں نے جواب دیا۔

نادیا نے آتشدان پر رکھے آگرے کے مرمریں فن پارے پر نظر ڈالی " یہ بھی سیاست کی دین تھا؟ " اس نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

" ایک حد تک یقیناً " مَیں نے جواب دیا " اگر مغل ہندوستان نہ آئے ہوتے تو یہ فن پارہ آج یہاں موجود نہ ہوتا "

فلسطین کا سنہرے گھنگھریالے بالوں والا نوعمر شاعر جمیل حسین نزدیک کھڑا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ اس کے پاس جورڈن کا پاسپورٹ تھا اور اس کے ملک کا نام دنیا کے نقشے سے غائب ہو چکا تھا۔ اور وہ عصری تاریخ کی تلخ ترین حقیقت تھا۔ اس سے کون کہہ سکتا ہے کہ میاں خالص شاعری کرو۔ یا آئرلیش کیون اور ایوان بولینڈ سے جن کے ورثے میں " ایسٹر ۱۹۱۶ء " شامل ہے یا امریکہ اور افریقہ کے کالے ادیبوں سے

آنسہ نادیا لبشاٹی کہ ایک خوش مزاج اور دلچسپ خاتون تھی سیاسی رویّے بھی رکھتی تھی ــــ بوجہ قبطی قوم پرستی مصر کی ہر اچھی چیز کا سلسلہ نسب فراعنہ سے جوڑتی تھی۔ (جس طرح ہمارے یہاں عہد جہابھارت یا اسلامی دور سے جوڑا جاتا ہے۔ یہ بھی تیسری دنیا کی مخصوص نفسیات ہے)۔

ایک روز مَیں نے سموسے تلے۔ نادیا کہنے لگی "مصر میں بھی انہیں سموسہ ہی کہا جاتا ہے"۔

"عرب اسے ہندوستان لائے ہوں گے۔ ہمارے بیشتر مسلم کھانے سنٹرل ایشیا مڈل ایسٹ ہی سے آکر رائج ہوئے"۔ مَیں نے جواب دیا۔

نادیا سموسہ نوش جاں کرتے ہوئے چند منٹ تک میری بات پر غور کرتی رہیں۔ پھر بولیں ــــ "نہیں۔ یہ عرب پکوان نہیں ہے۔ میرا آبائی گاؤں شمالی مصر میں ہے۔ وہاں سموسہ اسی صورت میں بنایا جاتا ہے۔ میرا گاؤں ایک قدیم قبطی بستی ہے۔ سموسہ یقیناً دور فراعنہ کی یادگار ہے۔ عرب پکوان نہیں ہے"۔

"ہو سکتا ہے"۔ میں نے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ فرعون پہلے سے سموسہ کھاتے چلے آئے تھے یا اسے عربوں نے ایجاد کیا۔ پھر مَیں نے تصوّر کیا فرعون مصر آمون رع سونے کے تخت پر بیٹھا ایک عدد سموسہ کھا رہا ہے۔ یا ملکہ نفرتی تی بیٹھی کڑاہی میں چھن چھن سموسے تل رہی ہے۔

"ہم قبطی فراعنہ کی اولاد ہیں"۔ نادیا بولی "آج بھی نفرتی تی ایک عام قبطی نام ہے"۔ لیکن عرب لیگ کے سفیر نے چند سال قبل فخریہ مجھ سے کہا تھا کہ تمام اہل مصر آل فراعنہ ہیں!!

نادیا روز شام کو پیانو کی مشق کے لئے یونیورسٹی کے میوزک اسکول جانے لگی۔ ایک شام اس نے واپس آکر کہا مدرسہ موسیقی میں محض طلبا کے لئے درجنوں اعلیٰ

ترین پیانو رکھے ہیں۔ دسمبر میں قرونِ وسطیٰ کی کلیسائی موسیقی کا ایک کونسرٹ ہونے والا ہے۔ مجھے اس میں گانے کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے۔ صبح سویرے لیلیٰ اور نادیا سامنے پارک میں چہل قدمی کرتیں جہاں JOGGING کرنے والے گزرتے رہتے۔ سارا امریکہ JOGGING میں بے طرح مصروف تھا۔ نادیا نظمیں لکھ رہی تھیں لیلیٰ نے نیا ناول شروع کر دیا تھا۔ لوگ باگ جب ایک دوسرے سے ملتے تو پوچھتے تم نے کام شروع کر دیا ہے؟ ارجن ٹینا کا رو ڈلفو مجھ سے پوچھتا ARE YOU WORKING مغربی ادیبوں کے لئے لکھنا ایک سنجیدہ پروفیشنل کام ہے۔

ہفتے میں ہر دوسرے تیسرے دن ایک ادیب یا شاعر کا سیمنار یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی و فلسفہ کی آراستہ و پیراستہ فیکلٹی لاؤنج میں منعقد ہوتا۔ قہوہ کوک یا بیئر پیتے ہوئے سیمنار کے بعد سوالات اور بحث و مباحثے ہوتے۔ چوتھی منزل پر اس پروگرام کے دفاتر تھے جن میں اسٹاف کے لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ پروگرام کے دبیز زرد قالین اور چمڑے کے صوفوں والے لاؤنج کی دیواروں پر ان اداں گارو ڈراموں موسیقی کے پروگراموں فلموں کے پوسٹر لگے ہوتے جو کیمپس پر روزانہ پیش کیے جاتے تھے۔ ایک دیوار پر پچھلے سال کے پروگرام کے شرکا کی تصاویر لگی تھیں۔ ایک تصویر میں فیضؔ صاحب ایک بلغاری ادیبہ کے ساتھ بیٹھے مشغلے میں مصروف تھے۔ میزوں پر اور الماریوں میں ادبی رسالوں اور کتابوں کے انبار۔

"ہمارے ادیبوں کو سوچنا چاہیئے کہ جو کچھ وہ بیحد جدید تصوّر کر کے لکھ رہے ہیں، وہ یہاں کس قدر فرسودہ ہو چکا ہے۔" ایک روز انڈونیزیا کے فرانتر نے برقی سماوار سے قہوہ نکالتے ہوئے مجھ سے کہا۔ امریکہ میں ذہنی فیشن تیزی سے بدلتے ہیں اور یہ سب پیٹ بھرنے کی باتیں ہیں۔"

دس پندرہ سال قبل ہندوستان کا زبردست FAD چلا تھا۔ روی شنکر۔ ستار۔
اگربتیاں کنڈالنی۔ شکتی۔ ہندو فلسفے۔ رقص یونیورسٹیوں میں اور انٹلکچویل حلقوں
میں بیحد ستار بجا۔ یہ اشتیاق بیٹلز نے مہارشی مہیش یوگی کے چیلے بن کر مغرب
میں عام کیا تھا۔ اور کیلی فورنیا کے فلاور چلڈرن نے اسے مزید تقویت پہنچائی تھی۔
اس وقت تک سوامی اور گرو اور مہیش یوگی کا ٹی۔ ایم۔ اور ہرے کرشنا" امریکن نظارے
کا ایک حصہ بن چکے ہیں اور اس میں کوئی نوولٹی نہیں رہی۔

آج کل سرخ چین کا زور ہے۔ اس نئی دلچسپی میں عالمی سیاست کا بہت بڑا
دخل ہے۔ "چینی ہفتہ" بڑے زور و شور سے منایا گیا۔ کچھ عرصہ قبل پال اینگل مع ہوالنگ
سرخ چین گئے تھے اور ان کے اس سفر کے متعلق نیوز ویک نے ایک پورے صفحے
کا مضمون شائع کیا تھا۔ اس پروگرام میں دو بہت اہم چینی پیکنگ سے آئے تھے۔
ایک بہت بڑی چینی ادبی کانفرنس یونیورسٹی میوزیم کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی جس
میں سارے امریکہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے چینی پروفیسر بھی شامل تھے۔
چینی ادیب تائیوان، سنگاپور وغیرہ سے آئے تھے۔ الغرض چینی ہی چینی۔ پال اینگل
نے جن ۴۲ چینیوں کے لئے کہا" دنیا میں چینی آبادی کے تناسب سے یہ ۴۲ نمائندے
توگویا فقط ایک عدد نمائندہ ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ بیحد چینی اوپیرا، چینی بازی گری
وغیرہ وغیرہ اسٹیج پر دکھائی گئی۔

ایک روز ہم لوگ دریائے مسی سپی کے کنارے آباد کواڈ سیٹیز گئے تھے۔ یعنی
ایک بہت بڑی بستی جو چار شہروں کا مجموعہ ہے۔ دریا پر پچھلی صدی کے نمونے کی
پہیئے سے چلنے والی دخانی کشتی جس طرح کی کشتیوں میں مارک ٹوین مسی سپی دریا پر
سفر کیا کرتے تھے۔ غسل خانوں کے پردوں پر پچھلی صدی کے اخبارات چھپے ہوئے
تھے۔ اسی قسم کے جہازوں پر سفر کرنے والے امریکن مشنری انجیلیں سنبھال کر جاپان

اور چین جایا کرتے تھے۔

گراں خواب چینی نے سنبھل کر یکایک ایک جھانپڑ۔

ہمالہ کے چشمے اُبلنے تو لگے مگر آج تک کچھ بات نہ بنی۔

جہاز کے بالائی عرشے پر ٹہلتے ہوئے مَیں نے پیکنگ کے پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے ڈائریکٹر سے پوچھا "آپ نے ہمالیہ پر حملہ کیوں کیا تھا؟"۔

اس نے مسکرا کر آنکھیں چندھیائیں اور جواب دیا۔"لندن میں سجّاد ظہیر اور ملک راج آنند میرے دوست تھے اور احمد علی"

"اسے کنفوشس کا فلسفہ کہتے ہیں یا تاؤ" مَیں نے پوچھا۔"آپ لوگ تو ہمارے بڑے قدیم پکّے دوست تھے۔ پھر۔؟"

"سب سویٹ یونین کی ریشہ دوانیاں ہیں" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"لیکن آپ دونوں ملک تو کمیونسٹ ہیں"۔"اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔

مَیں نے فلسطین کے جمیل حسین کو دیکھ کر دل میں اضافہ کیا۔ جمیل حسین ہنگری میں چھ سال پڑھ کر آیا تھا اور ہنگرین شاعرہ ایگنیس سے بزبان ہنگرین گفتگو کرتا ہُوا بونے اڑانے میں مصروف تھا۔ چینی ادیب نے جواب دیا"تم کو مغربی کلاسیکل موسیقی سے دلچسپی ہے؟"۔

"آپ کو پال روبسن کا اول مین رور پسند ہے؟" مَیں نے جواب دیا۔

دریائے مسی سپی کے دونوں کناروں پر کواڈ سٹی کی سر بفلک عمارتیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

روسی" والگا بوٹ مین کا گیت اور امریکن" اول مین رور"۔ عظیم دریاؤں کی اپنی خفیہ زبان ہے۔ چینی ادیب مغربی کلاسیکل موسیقی کا رسیا تھا۔ موسیقی کی بھی سرحدیں نہیں ہیں۔

لیکن سرحدیں ہیں۔ زیوبن مہتہ عربوں کے لئے اپنا آرکسٹرا شاید کنڈکٹ نہیں
کرے گا۔
خوش مزاج یونانی شاعر آری بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور چپکے سے بولا۔
"تم کو ایک مزیدار بات بتاؤں۔ کسی سے نہ کہنا۔ اولگا مائیکل سے شکایت کر رہی
تھی کہ کل الفریڈو اسے گھر پہ چھوڑ کر صبح سے شہر چلا گیا اور شام پڑے واپس آیا۔
مائیکل نے جواب دیا" مادام اگر میں الفریڈو کی جگہ ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا"۔ یہ خبر
دے کر آری عطارد کی سی برق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ متبسم میری پاس سے
گذری اور کہا" آری نے تم کو وہ لطیفہ سنایا؟ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی سے نہ
کہنا۔ اب تک تین چار لوگ آ آ کر مجھے یہ لطیفہ سُنا چکے ہیں"۔ ایلزبتھ ٹیلر کی ہمشکل
کولمبیا کی شاعرہ اولگا اپنے نیازمند شوہر الفریڈو کے ساتھ عرشے کی ریلنگ
کے سہارے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ فوٹوگرافر اس کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔
اولگا اور الفریڈو نئے دلہا دلہن تھے۔ دونوں کی دوسری شادی تھی۔ اولگا کی پہلے
شوہر سے لڑکی بائیس سال کی تھی۔ اولگا بیلر تیارہ چکی تھی۔ ہر وقت لائم لائٹ
میں رہنا چاہتی تھی۔ سب لوگ اس کی ان بے ضرر حماقتوں کے عادی ہو چکے تھے۔
نیکدل تھی اور اس کی وجہ سے بہت بارونق رہتی تھی۔ روز اس کا کوئی نہ کوئی لطیفہ
سب تک پہنچ جاتا تھا۔
نیچے بال روم میں رقص شروع ہونے والا تھا۔ پال اینگل حسب معمول ایم سی
بنے اودھم مچا رہے تھے۔
" اس بزرگ شاعر میں کس قدر زندہ دلی اور انرجی ہے۔ اس عمر میں سینکڑوں میل کار
چلاتا ہے۔ سوئمنگ کرتا ہے۔ دوڑتا ہے۔ ہمارے ہاں اس عمر کے لوگ بڈھے پھونس ناتواں
نڈھال تلخ مزاج کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگتے ہیں۔ انڈونیزین ارشو مینڈو نے کہا۔
میں نے اس عمر کے خستہ حال اردو شاعروں کا تصور کیا۔ جن کے مرنے کے بعد ان کے بیوی بچوں

کے لئے چندہ کی اپیل کی جاتی ہے۔ تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو۔

اولگا ہال روم میں پہنچ چکی تھی۔ اور ارجن ٹائین کے روڈلفو کے ساتھ ایک ہسپانوی گیت سنانے میں مصروف تھی۔

ارشویندو اور اس کا ہمزاد فرانز ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ ارشویندو نے اپنی سیاہ ترا قلی پر ہاتھ پھیرا۔ اس وقت وہ دنیا سے بے حد مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ "میں یہ ٹوپی اس لئے پہنتا ہوں کہ فرانز سے مختلف نظر آؤں۔ یہاں سب مجھ میں اور فرانز میں گڑبڑا جاتے ہیں" اس نے مجھے سمجھایا۔ بالی کا فرانز ماہر فن آرٹسٹ بھی تھا۔ میز پر رکھے کاغذی نیپکن پر اس نے اولگا کا اسکیچ بنا کر عربی رسم الخط میں اپنا نام لکھا۔ میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ وہ حسب عادت باچھیں کھلائے بولا۔ "میں اکثر فلپائن جاتا رہتا ہوں۔ وہاں مسلمانوں کے خلاف کافی تعصب ہے۔ ان کے موریسکو پرابلم کی وجہ سے۔ اس لئے میں نے اپنا نام فرانز FRANZ رکھ لیا۔"

غور کیجئے۔ ہسپانوی نوآبادکاروں نے جزائر شرق الہند پہنچ کر وہاں کے مفتوح مسلمانوں کو بھی مُور کہا۔ ہسپانیہ کے مسلمان مُور کہلاتے تھے کہ اوّلاً مراقش سے وہاں پہنچے تھے۔

فلور پر ایک خوش شکل لوچدار چینی نے تنہا ڈسکو رقص شروع کیا اور کبرت نائیم کے چند جنتر دکھلائے۔ وہ ماہر ڈسکو رقاص تھا۔

رات گئے جہاز ڈیلون پورٹ کی دریائی بندرگاہ پر واپس پہنچا۔ ہم لوگ اس وقت ریاست اِلی نوائے میں تھے۔ کوچیں آیوواسٹی کی طرف روانہ ہوئیں۔ ایک کوچ میں اگلی سیٹ پر شرق اوسط کی لیلیٰ اربل اور نادیا لبشائی نے انگریزی گیت شروع کر دیئے نزدیک بیٹھے پولینڈ کا مائیکل فوراً ہاتھ اٹھا اٹھا کر بے ساختگی کے ساتھ گویا ان دونوں کو کنڈکٹ کرنے لگا۔ یورپ اور بحیرہ روم کی کلچر! کوچ کا موٹا سفید فام امریکن ڈرائیور راد

توصیفاً سر ہلایا گیا۔ وہ آٹھ ڈالر فی گھنٹہ کماتا ہے۔ ڈیلو واپس جا کر اپنی کار میں بیٹھے گا اور اسٹیریو پر اپنی پسندیدہ موسیقی سنے گا۔ مائیکل بھی پولینڈ اپنے ایک معقول منصفانہ اشتراکی ماحول میں واپس لوٹے گا۔ جہاں کوئی بھوکا نہیں مرتا۔ لیکن لیلےٰ اور نادیا اپنے کس قسم کے معاشروں میں واپس جائیں گے؟ ۔ غربت، تشدد، سیاسی بدامنی، بے اطمینانی۔ ترکی میں بڑھتے ہوئے سیاسی قتل و غارت کے متعلق لیلیٰ اکثر اداس ہوتی ہے۔

لیلےٰ اور نادیا جو اس وقت انگریزی اور امریکن اور فرنچ گیت گا رہی ہیں۔ ان کی مغرب سے یہ تہذیبی یگانگت سطحی اور مصنوعی ہے کیونکہ معاشی برابری کے بجائے شدید معاشی تضاد پر مبنی ہے۔

کہرے میں چھپے جزیرے

یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف آرٹ کے ریٹائرڈ صدر اور آرٹ کے مورخ پروفیسر سی برلنگ شہر سے دُور ایک جنگل میں ندی کنارے اپنے دو منزلہ پلیٹ گلاس مکان میں رہتے تھے۔ فرنچ کٹ داڑھی، پستہ قد، منکسر المزاج، ندی کے رُخ ان کا وسیع میوزک روم مجسموں اور اطالوی نشاۃ ثانیہ کی اوریجنل تصاویر سے آراستہ تھا۔ اوپر سامعین کے لئے چوطرفہ گیلری۔ پیانو کے نزدیک مختصر اندرونی باغیچہ۔

اس شام چینیوں نے ان کے مکان کے سبزے پر اپنے کمالات دکھا ایک چینی نے بانسری بجائی۔ ہوالنگ اینگل کی رقاصہ لڑکی نے (جوان کے سابق چینی شوہر کی اولاد اور ایک انگریز کی بیوی تھی)، "تتلی کا رقص" پیش کیا۔ ایک چینی لڑکی نے چینی گانا سنایا۔ امریکن اسی اخلاق اور صبر سے سنا کیے جس طرح وہ غیر مغربی موسیقی سنتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ چینی جاپانی موسیقی مجھے بھی بے سُری معلوم ہوتی ہے کیونکہ گو سنگیت یونیورسل ہے مگر ہر قوم کی لے اور چند اندرونی سُر جداگانہ بھی ہو سکتے ہیں۔

رات کو یونیورسٹی کوارٹریٹ نے پروفیسر سی برلنگ کے میوزک روم میں

پنا پروگرام پیش کیا۔ امریکن سامعین دفعتاً اپنی مانوس دنیا میں لوٹ آئے۔ چینی
ی کے مُسرّت کل دہ معقولات تھے۔

عصرانے کے دوران مشہور اخبار دی موائین رجسٹر کے ایک سینئر صحافی سے
'ہندوستانی سیاست میری جھڑپ ہو چکی تھی۔ اب مع تمام سامعین بڑے انہماک
ٹیمبر ہیبوزک میں محو تھا۔ اس وقت اچانک میری نظر اس مجسمے پر پڑی۔
کوارٹریٹ کے نزدیک ایک گملے کے نیچے رکھا وہ چھوٹا سا مجسمہ ایک فاقہ زدہ
ئی لڑکے کا تھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی بے چارگی اور احساس
ں کا حقیقت آمیز تاثر حیرت انگیز تھا۔ وہ ننھا لڑکا احساسِ فراغت اور عشرت
ریبی اور روحانی طمانیت کے اس ماحول میں ایک کونے میں چھپا یہ سب دیکھ دیکھ
پتھرا چکا تھا کسی نے بھی اس مورتی کا نوٹس نہیں لیا تھا چلتے وقت میں نے
بسر برلنگ سے پوچھا۔

یہ مجسمہ میرے ایک شاگرد نے جنوبی ایشیا میں بنایا تھا۔ یاد نہیں آرہا کون سے
ہں۔" انہوں نے جواب دیا۔

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلحاظِ فقر و فاقہ جنوبی ایشیا کے سارے ملک یکساں ہیں۔
پروگرام کی کاریں اور منی بسیں اسٹاف کے لڑکے ایڈون اور لوب اور
ں چلاتی تھیں۔ یہ گاڑیاں پروفیسر کے مکان سے کچھ دور جنگل کے راستے پر
تھیں۔ لوگ باگ حسبِ معمول ٹکڑیوں میں بٹ کر اطمینان سے ٹہلتے ہوئے آرہے
یں لوب کی اسٹیشن ویگن ڈھونڈتی اکیلی ذرا آگے نکل گئی۔ رات کا اندھیرا
تھا اور اونچی اونچی گھاس میں جھینگر بول رہے تھے۔ ایک جگہ لوب کی
وتح نظر آئی۔ اس کا انجن حسبِ معمول چل رہا تھا۔ دروازے پر ایک اجنبی متبسم چہرہ۔
ہلو۔" میں نے کہا۔ "یہ انجن کیوں چل رہا ہے؟ متواتر نہ جانے کب سے چل رہا ہے۔

امریکن انرجی بچا رہے ہیں۔"

اجنبی نے ہنس کر جواب دیا" ہو - مَیں فلپائن سے آ رہا ہوں ابھی ابھی۔
مجھے سیٹڈر ریپلٹڈز ایئر پورٹ سے سیدھا یہاں لے آیا۔ صرف چند منٹ پ
اس وجہ سے مَیں پارٹی میں شامل نہ ہو سکا۔ میرا نام ہوزے لکابا ہے۔"

"ہلو۔ ہوزے۔" مَیں نے کہا۔" تم اتنی دیر میں یہاں کیوں پہنچے۔ پیرا گرا
شروع ہوئے تو تین ہفتے ہو گئے۔"

"مَیں جیل میں تھا۔ جب دعوت نامہ پہنچا۔ پیرول پر چھٹا تو فوراً یہاں کُ
کٹا یا۔" اس ضمانت پر کہ یہاں سے سیدھا وطن واپس جاؤں گا۔"

"جیل میں کیوں تھے؟"

" عموماً ادیبوں کو جیل کیوں بھیجا جاتا ہے؟ سیاسی احتجاج۔"

" فلپائن کی سیاست کا اب بھی وہی حال ہے جو مَیں نے وہاں دیکھا تھا
مَیں نے سوال کیا۔

پروفیسر جارج سی برلنگ کا پلیٹ گلاس دو منزلہ۔ یونیورسٹی کا اسٹرنگ کا
بڑھیا ڈربہ۔ اس میں مصیبت زدہ تیسری دنیا کے سفیرانِ حرم آتے ہیں۔

" دیکھو سب کاروں کے انجن چل رہے ہیں۔" ہوزے نے اظہارِ خیال کیا۔

" یہ تھرد ادے سوسائٹی ہے بے تماشا کھانا جو بچ رہتا ہے کوڑے میں پ
دیتے ہیں۔ سال کے سال فرنیچر بدلتے ہیں۔ ذرا جی بھرا تو کاریں جا کر "کاروں کے
میں ڈال آتے ہیں۔ ایسی فضول خرچیوں کی عادت کے بعد اب کار ٹران سے
بچاؤ تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اللّے تللّے کی عادت مشکل سے چھٹتی ہے۔ ان
میں ہر کمرہ روشن رہتا ہے۔ کمرے کی بتی بجھانا جانتے ہی نہیں۔ تم نِک ہو کن کا
مَیں ان سے ٹوکیو اور اس کے بعد منیلا میں ملی تھی۔"

"نِک ہوکن ؟ — وہ اب ہمارے ملک کا نیشنل آرٹسٹ ہے۔ اسٹیبلشمنٹ
شامل ہو چکا ہے —"

وہی پُرانی کہانی

جب مَیں نِک ہوکن سے مِلی تھی۔ وہ اسی ہوزے کا ہم عمر رہا ہوگا۔ ہوزے
ح کے اسٹیبلشمنٹ کا باغی تھا اور قید خانے سے پیرول پر امریکہ آیا تھا۔

ریاست کے صدر مقام ڈی موائن (یہ بھی ایک فرینچ نام ہے اور اس ریاست
ِ سابقہ فرینچ تسلّط کی یادگار) مَیں امریکن انشورنس کمپنی کی موڈرن آرٹ کے بیش بہا
ِنوں سے آراستہ فیوچرسٹک عمارت کی ایک منزل کے پلیٹ گلاس برآمدے میں
ے ایک نظارہ۔

نیچے چوک میں مشہریوں کے گروہ جمع تھے۔ کچھ لوگ چھتوں پر چڑھے ہوئے
ے۔ سامنے دو بہت اونچی عمارتوں کے درمیان استادہ ایک نسبتاً پرانی اتنی ہی اونچی
رت کو بارود سے منہدم کیا جانے والا تھا۔

خالی سڑک پر چند آدمی ایک مشین لے کر آئے۔ ایک بٹن دبایا۔ دھماکہ ٹھیک
ھ سیکنڈ کے اندر وہ پوری عمارت منہدم ہوگئی۔ اور اس طرح کہ اس سے بالکل سٹی
ُئی عمارتوں کی کھڑکیوں کے شیشوں پر بال بھی نہ پڑا۔ دھوئیں کے سیاہ بادل چاروں طرف
ِیل گئے۔ چند منٹ میں دھواں تحلیل ہُوا۔ روشن دھوپ میں اس عمارت کی جگہ ملبے
ڈھیر پڑا تھا۔ محض آٹھ سیکنڈ۔

اس ساؤنڈ پروف بلوری برآمدے میں سے وہ بے آواز منظر سائنس فکشن
یک حصّہ معلوم ہُوا۔ ایک پوری عمارت پلک جھپکتے میں غائب۔

"پُش بٹن تہذیب۔ برائے تعمیر و تخریب"

نزدیک کھڑے یونان کے آری نے حسبِ عادت چپکے سے اظہارِ خیال کیا۔

شام کے وقت ڈی مواٹن کے ایک ہرے بھرے پُر فضا محلے میں رسالہ "ہو
اینڈ گارڈنز" کے ناشر کی بیوہ کا مکان ۔ اونچی چھت والا ایوان نشست پکاسو اور
کلی اور دوسرے جدید استادوں کی اوریجنل تصاویر اور برنجی مجسموں اور آڑ
ترچھے اُلجھے ہوئے تار کے گچھوں وغیرہ سے (جو موڈرن اسکلپچر کہلاتے ہیں اور
لوگ ان پر کتابیں لکھتے ہیں ۔ اور ان کو لاکھوں روپے میں خریدتے ہیں ۔) سجا ہُوا
پچھلے چبوترے پر موڈرن اسکلپچر کا ایک برنجی قد آور مجسمہ استادہ تھا ۔ مَیں نے ا
بُت کو بہت غور سے دیکھا ۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ چبوترے کے سامنے خاتو
کا جنگل مع سوئمنگ پول نظر آرہا تھا ۔ خزاں کے سُرخ پتّے گھاس پر اُڑتے پھر
تھے ۔ پیٹر ناصرہ چبوترے پر بیٹھا چُپ چاپ منظر ملاحظہ کر رہا تھا ۔ برنجی مجسّمے کے
کے پیچھے اچانک مجھے ایک گول پلیٹ نظر آئی ۔ یہ ہالہ ہے ۔ مَیں نے سوچا ا
پیٹر سے کہا " پیٹر یہ جیزس کرائسٹ ہے "
" نہیں میرے خیال میں یہ کاؤبوائے ہے "
" ہرگز نہیں قطعی جیزس کرائسٹ ہے ۔ سر کے گرد ہالہ ہے ۔ وہ پلیٹ ملا
کرو ۔ علاوہ ازیں کاؤبوائے ایسا چوغہ کہاں پہنتے ہیں ؟"
عین ممکن ہے کہ رات کے وقت وہ بطور لباس شب خوابی ایسا چوغہ پہنت
ہوں ۔ پچھلی صدی میں " پیٹر نے جواب دیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا ۔
" لیکن تم نے یہ غور کیا کہ اس خاتون نے یہ کاؤبوائے یا جیزس کرائسٹ
مہنگا خریدا ہوگا " ہنگری سے آئے نوجوان یہودی ادیب مائیکلوس ہزارتی نے قر
آکر زمین پر اکڑوں بیٹھے ہوئے ۔ شگفتگی سے مجھے مخاطب کیا ۔ چبوترے پر صر
پیٹر ، مائیکلوس اور مَیں اس مجسّمے کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھے ۔ باقی سب لو
اندر تھے ۔

"یہ سب اس خاتون کے ایجنٹ کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ آرٹ کے ذخیرے امیروں کا اسٹیٹس سمبل ہیں۔ اس سے انہیں غرض نہیں کہ وہ کیسے ہیں۔" مائیکلوس نے اضافہ کیا۔

ہم لوگ دیوان خانے میں واپس آئے۔ اب ہنگرین شاعرہ ایگنس چپکے سے بولیں: تم نے میزبان خاتون کا بیڈ روم دیکھا؟ اس قدر غیر شخصی۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔"

میں فوراً گئی۔ سفید قالین۔ سفید منک کے پلنگ پوش۔ غسل خانے میں سفید منک کا غالیچہ۔ پورا سویٹ برف کا خواب معلوم ہوتا تھا۔ اس کے برابر ایک مورننگ روم میں مزید ماڈرن ماسٹرز دیواروں پر آویزاں تھے۔ میں نے واپس آکر ایگنس کے نرم مزاج شوہر بالازنیگل سے کہا چلئے وہ کمرہ بھی دیکھ آئیے۔ وہ میرے ساتھ مورننگ روم میں گئے۔ تصاویر دیکھیں اور واپس آئے۔ ان کے چہرے پر شدت کی ملائمت اور نرمی تھی۔ بیوی کے چہرے پر اداسی۔ بڑا پُرسکون اور باوقار جوڑا تھا۔ ان دونوں کے پاس ان کا نوعمر ہم وطن یہودی مائیکلوس فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ بولا "ہم لوگوں نے بچپن سے اس طرح کے مکان ہالی وڈ فلموں میں دیکھے تھے اور یہ ضعیفہ یہاں تنہا رہتی ہیں۔ اولاد اسی شہر میں موجود ہے۔"

" مائیکلوس" میں نے کہا" اس وقت سے ڈرو جب منک کا پلنگ پوش ساری جذباتی رشتوں کا نعم البدل رہ جائے۔"

ٹینس امریکن امراء کا محبوب کھیل ہے۔ دیوان خانے کے ایک گوشے میں ایک آرٹ کے مورخ جمیل حسین فلسطین کی ایک گرل فرینڈ سے گفتگو کر رہے تھے جمیل حسین اتنا خوبصورت نوجوان تھا۔ اس نے چھانٹ کر اپنے لئے اتنی ہی بدشکل لڑکی چُن لی تھی جو اب اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ لڑکی پروفیشنل کوچ تھی۔ لڑکی کاٹنے کے لئے آرٹ کے مورخ میز پہ بلائے گئے۔ چینی آرٹ پر موصوف کی ایک بے حد ضخیم مصوّر کتاب حال

ہی ہیں شائع ہوئی تھی۔ پیٹر چبوترے سے واپس آکر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"چین" میں نے پال اینگل سے کہا "امریکہ کا نیا FAD ہے۔ نہیں"

"چین اور جاپان دونوں نے امریکنوں کو ہمیشہ سے مسحور کیا ہے۔ جب سے ہمارے پڑھے لکھے وہاں بطور مشنری اور تاجر جاتے تھے ـــ لیلیٰ گانا سناؤ" اچانک پال نے نعرہ لگایا۔ "انگریزی نہیں ترکی"

"یہ گیت انقلاب کے متعلق ہے" لیلے نے ذرا توقف کے بعد شرماتے ہوئے کہا۔ اور گیت بزبان ترکی سنایا۔ جسے سب نے اسی اخلاق سے سنا جس طرح انہوں نے چینی گیت سنے تھے۔ کم گو لیلے نے کبھی تذکرہ نہیں کیا لیکن شاید وہ ہلکی سے لفٹ ونگ تھیں۔ ان کی کہانیوں کا سوویٹ یونین میں ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔

"انقلاب کے لفظ سے اب وحشت ہوتی ہے۔ دیکھو ایران میں کیا ہو رہا ہے" ایک ایشیائی نے چپکے سے مجھے مخاطب کیا۔

"میرا نصب العین ہے لنک کے پلنگ پوش"

اگر آپ کتابیں لکھتے یا چھاپتے ہوں تب بھی عیش کیجئے بھٹے اگاتے ہوں اور سؤر پالتے ہوں تو ہمارے ہاں فاقہ زدہ چمار پالتے ہیں۔ سؤروں کے اس فارم یعنی دار الخنازیر کے مالک ایک ضعیفہ اور اس کے دو بے حد ہینڈسم بیٹے تھے۔ وہ گھوڑے پہ اپنے خنازیر پال پوس کر بڑی بڑی کمپنیوں کو فروخت کرتے تھے۔ جہاں ان کو نہایت نفیس پورک اور بیکن میں تبدیل کیا جاتا تھا اور . . . وہ ایرکنڈیشنڈ سُوپر مارکیٹوں کے گلاس کیسوں میں پڑے جھلجھلاتے تھے یعنی ایک سؤر کا ارتقاء ـــ فارم میں مارے تعفن کے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا اور سؤر تھے کہ مع اہل و عیال غلاظت میں لوٹ لگا رہے تھے۔

"دیکھو خانم لیلیٰ - اسی لئے اسلام میں سؤر حرام ہے۔" مَیں نے بحیثیت خاتون مولوی اس لادین ترک خانم کو سمجھایا۔" یہ جو تم صبح شام بیکن اور ہیم پورک اڑاتی ہو غور سے دیکھ لو۔"

لگے ہاتھوں مَیں نے نادیہ قبطیہ سے بھی تبلیغ کر ڈالی۔"دیکھو، سیلوبہ سے ہم اہلِ اسلام سؤر نہیں کھاتے۔"

ناک پر رومال رکھ کر نادیا اور لیلےٰ وقتی طور پر متاثر نظر آئیں۔

مالکان دارالخنازیر کے مکان کے سامنے ان کے دفاتر کی بیرونی دیوار پر لکھا تھا۔

HOGS ARE BEAUTIFUL

جان ڈیر پچھلی صدی میں ایک دیہاتی لوہار تھا جو اپنے گاؤں میں ہل پھاوڑے دکداں، کھرپیاں وغیرہ اپنی چھوٹی سی بھٹی میں ڈھالا کرتا تھا۔ پھر وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ جان ڈیر کمپنی آج ایک ایمپائر ہے۔ جس کے ٹریکٹر ساری دنیا میں چل رہے ہیں۔"

امریکن کامیابی" کی نمائندہ کہانی شہر مولین میں اس کارخانے کے صدر دفاتر کی فولاد کنکریٹ اور شیشے کی عمارت کے سامنے اینڈ اسکیپ باغ میں بیدِ مجنوں سے گھرے ہوئے ایک جزیرے پر سنہری سؤر کا ایک مجسمہ رکھا ہے جسے بذریعہ ہیلی کوپٹر وہاں اتارا گیا تھا۔ عمارات کی فرلانگوں لمبی راہداریاں اور ایوانِ دنیا کے موڈرن آرٹ کی بیش قیمت ترین تصاویر سے آراستہ۔ یونان کے شاعر آری کے ردِعمل بے حد مشرقی تھے۔ ایک طویل گیلری میں سے گذرتے ہوئے وہ چپکے سے بولا۔" ساری دنیا کا بہترین آرٹ دولت کے بل پر یہاں سمیٹ لائے ہیں۔"

مشرقی یوروپ کے ادیب اس عمارت کے ٹیکنولوجیکل عجائبات کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہاں انسانوں کے بجائے روبو کام کرتے ہوں گے۔" پولینڈ کے مائیکل نے آہستہ سے کہا۔

نیچے ایک مسقّف گلشن تھا۔ آری حیرت زدہ رہ گیا ”تم نے غور کیا“ وہ مجھ سے بولا۔ ”کہ یہ سارے پھول پتّے اور گھاس مصنوعی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ایک پتّہ غیر حقیقی انداز سے چمک رہا ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے مَیں سائنس فکشن کے ماحول میں آگیا ہوں۔“

”اکیسویں صدی کی ایک جھلک“ مَیں نے جواب دیا۔

”مگر اب یہ اس سے اور آگے کہاں جائیں گے؟“ آری نے دریافت کیا۔

”بائیس ویں صدی میں“ مَیں نے جواب دیا ”تم چھٹی صدی قبل مسیح کے آدمی ہو۔ لیکن مغربی تمدّن کے باوا آدم بھی ہو۔ یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے۔ نہ تم لوگوں نے گریک اسپرٹ اہلِ مغرب کو عطا کی ہوتی نہ یہ سب ہوتا۔ لیکن آج خود تم لوگ پسماندہ اور غریب رہ گئے اور یہاں آکر محض ریسٹوران چلاتے ہو۔“

ڈی موائن کے باہر جنگل کے ایک لکڑی اسٹور میں ایک نوجوان پچھلی صدی کا لباس پہنے، پچھلی صدی کی مصنوعات فروخت کر رہا تھا۔ ایک چوبی کیبن میں سایہ پہنے ایک عورت دودھ بلو رہی تھی۔ دوسری عورت کنویں میں سے پانی لا رہی تھی۔ ایک لڑکی مکان کے باہر چرخہ کاتنے میں مصروف تھی۔ اکیسویں صدی سے واپس پچھلے زمانوں میں پہنچ کر امریکنوں نے اپنی مختصر سی تاریخ کو جگہ جگہ بڑے پیار سے سجائے رکھا ہے۔ اس لونگ ہسٹری فارم میں پائینیرز کے کیبنوں کے علاوہ ایک بڑے گاؤں میں لوہار کی دکانیں، ڈاکٹر، پنساری، زمیندار کا بڑا مکان۔ ہر چیز بجنسہٖ دوبارہ تعمیر کی گئی تھی اور اس میں اسکول کے بچّوں اور سیّاحوں کے لئے اسی زمانے کے پوشاکوں میں ملبوس لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اسکول ہاؤس میں سایہ پہنے ٹیچر بچوں کو پڑھاتی بالکل انیسویں صدی کی امریکن ناول کا ایک کردار معلوم ہوتی تھی۔ حبشی غلاموں کے جھونپڑے مفقود تھے۔ کیونکہ شمال کی ریاستیں غلامی کے خلاف تھیں۔ جنوب کے

مظلوم غلام پناہ لینے کے لئے شمال بھاگ آتے تھے۔ فرار کا راستہ "انڈر گراؤنڈ ریلوے" کہلاتا تھا۔ جس کے متعدد اسٹیشن اس جمہوریت پسند ریاست میں موجود تھے۔ لیکن آج یہ ریاست سیاسی اور سماجی لحاظ سے قدامت پسند ہے۔

ریاست آئیووا ملک کے متموّل ترین کسانوں کا دیس ہے جو بھٹے اگاتے ہیں اور ذاتی طیارے رکھتے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں خروشیف امریکی زراعت کے مطالعے کے لئے اسی ریاست میں مدعو کئے گئے تھے۔ اس بھٹوں کے کھیت کے درمیان واقع امریکی وڈیرے، مسٹر وِلسن بھٹو کے دو منزلہ مکان کا طرزِ آرائش "بیریڈ امریکی" تھا۔ باہر جان ڈیر کمپنی کے جغادری ایرکنڈیشنڈ ٹریکٹر کھڑے تھے۔ جنہیں میاں بیوی وِلسن اور ان کے لڑکے چلاتے تھے۔ اس قسم کا مثالی امریکی سادہ لوح دیہاتی خاندان جس کی تصویریں ایک زمانے میں نارمن روک ویل لائف کے سرورق پر بنایا کرتا تھا۔

باہر سیب کے درختوں کے نیچے مسٹر پال اینگل بینچ پر بیٹھے دورۂ چین کا ذکر کر رہے تھے۔ جب میں نے ان سے پوچھا "یہاں آس پاس کوئی کویکر گاؤں نہیں ہوگا؟"
"اتفاق سے ایک کویکر کسان یہاں لنچ کے لئے مدعو ہے۔ اس سے پوچھتا ہوں!"
فوراً زقند بھر کر مکان کے اندر گئے۔ چند منٹ بعد آکر کہا "ایک کویکر بستی یہاں سے پندرہ میل دور ہے۔ چلو ابھی تم کو دکھلائیں۔"

وہ کویکر قریہ میپل کے درختوں اور سبزہ زاروں سے پُر۔ ایک تصویر کی طرح نظر فریب اور پُرسکون اس کے جماعت خانے میں جا کر ہم لوگ بنچوں پر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ کویکر کسان نے (جو مسٹر ولسن کے فارم سے ہمارے ساتھ آیا تھا) کہا "یہ جماعت خانہ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ ہم سب امن پرست اور جنگ کے مخالف ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو فرینڈز کہتے ہیں!"

(سوسائٹی آف فرینڈز ۱۶۵۰ء میں انگلستان میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی جارج فوکس نے انگریزی خانہ جنگی کے دوران اولیور کرامویل سے کہا تھا کہ میں خدا کو گواہ کر کے تجھ سے کہتا ہوں کہ میں کسی کے خلاف تلوار نہیں اٹھاؤں گا کسی سے جنگ نہیں کروں گا کہ خونریزی عیسےٰؑ کی روشنی کی مخالف ہے۔ امریکہ میں کویکرز نے سُرخ ہندوستانیوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے اور امریکن انقلاب سے قبل اپنے کالے غلام آزاد کر دیئے)

"ہمارے عبادت خانے میں پادری نہیں ہوتا۔ خدا سے بندے کا ڈائریکٹ رشتہ اصل چیز ہے۔" کسان نے کہا۔

نادیا میرے برابر بیٹھی۔ بور ہو رہی تھی :

"یہ کس قسم کا چرچ ہے۔ اس میں صلیب تک نہیں۔ بغیر پادری اور صلیب کے بھی بھلا کوئی چرچ ہو سکتا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نادیا زکی لشائی۔" میں نے کہا۔ "یہ کویکر ہی سچے عیسائی ہیں۔ یہ میرے پسندیدہ لوگ ہیں۔ سارے مغرب میں سب سے زیادہ متوازن صلح پرست اور امن پسند لوگ۔ جو تم کو ملیں گے۔ تم کو پتہ چلے گا کہ وہ یا خود کویکر ہیں یا کویکر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

"بغیر پادری کا چرچ۔ یہ کس قسم کی عیسائیت ہے۔" نادیا نے بیزاری سے دہرایا۔

"یہی سچے عیسائی ہیں۔" میں نے بھی دہرایا۔ "میں ایک ایسے امریکن خاندان کو جانتی ہوں جو اب تک ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے انجیلِ مقدس کی زبان اور THOU اور THEE استعمال کرتے ہیں۔ کیا پیارے لوگ ہیں۔ اور ذرا سترھویں صدی انگلستان اور امریکہ کے اصول پرستوں کا خیال کرو۔ وہ بھی کیا ولولہ خیز زمانہ رہا ہوگا۔

باہر ایک چھتنا میپل کے نیچے کوچ کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میرے علاوہ کسی کو اس کویکر گاؤں سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن کوچ میں سوار ہوتے ہوئے پیکنگ کے

شاڈسن نے پال اینگل سے کہا۔
"یہ کویکر فلسفہ ہندوستانی فلسفہ کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کی روشنی تمہارے اندر موجود ہے۔ وغیرہ۔ یہی اسلامی تصوّف بھی ہے۔ آپ تو مسلمان ہیں نا؟" شاڈسن نے لیلےٰ اریل سے پوچھا۔
"نہیں محسن نام کی۔" اس نے دہرایا اور سگریٹ سلگا لیا۔ بیشتر ترک خواتین کی طرح وہ لگاتار سگریٹ نوشی کرتی تھی۔
میپل کے درخت چنار سے مشابہ ہیں۔ کویکر فلسفہ ویدانت اور تصوّف سے مشابہ ہے۔ استانبول کی لیلےٰ اریل اپنی جڑوں سے کٹ چکی ہے۔ وہ کس سے مشابہہ ہے؟
مے فلاور کے سامنے پارک میں ٹہلتے ہوئے اس نے ایک دفعہ خود مجھ سے کہا تھا کہ ہم کو اب یہ احساس بیحد شدید ہو چکا ہے کہ لاطینی رسم الخط اختیار کر کے اور یورپ سے رشتہ جوڑ کر ہم اپنے تہذیبی ورثے سے بالکل کٹ گئے۔
"بڑی عجیب کشمکش کا دَور ہے۔" مَیں نے کہا تھا۔ "یا اتاترک کی لادینی یا آج کل کی انتہا پسند اسلام پرستی تجدیدیت میں انتہا پسندی کا خطرہ بھی مضمر ہے۔ ہمارے ہاں برِصغیر میں کلام مجید کی تفاسیر مختلف فرقوں کے علماء نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے لکھی ہیں۔
سامنے ندی کے کنارے اس شام نادیا فکہ سعر میں محوِ ٹہل رہی تھی۔ اس روز اس نے لکھا تھا۔ "اس کہرے میں ننھے جزیرے پیدا ہوتے ہیں اور تتلیاں مرتبان میں پھڑپھڑاتی رہتی ہیں۔"

خیاباں خیاباں ارم

الارم صبح چار بجے کا لگایا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے ایرپورٹ لموزین کے ڈرائیور نے نیچے سے فون کیا تب آنکھ کھلی ٹھیک سات بجے سیڈر ریپڈز سے شکاگو جانے والا طیارہ چھٹتا تھا۔ ہڑبڑا کر نیچے گئی۔ لموزین کا ڈرائیور جو خالص ورکنگ کلاس امریکن تھا۔ خنک اندھیرے جنگلوں کی طرف چلا جہاں روشن راستوں کے کنارے خوبصورت دومنزلہ مکان خوابیدہ تھے۔ چند ایک میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ڈرائیور ایک مسافر کا پتہ بھول گیا تھا۔ اور بار بار چند سڑکوں کا چکر لگا کر وائرلیس پر اپنے دفتر سے کہتا جارہا تھا I AM HAVING PRODIEMS جو امریکنوں کا سب سے بڑا تشکائیتی جملہ ہے۔ لموزین کے دفتر نے کمپیوٹر کے ذریعے معلوم کر کے ڈرائیور کو چند سیکنڈ میں گمشدہ پتے سے مطلع کیا۔ اس نے کار ایک مکان کے سامنے جا کر روکی۔

ایک خاتون بریف کیس سنبھالے برآمد ہوئیں۔ دوسرے مکان سے ایک اور خاتون مع بریف کیس۔ دونوں از حد الیفی شنٹ۔ اور بریلیک۔ ہر امریکن عورت از حد الیفی شنٹ اور بریلیک ہوتی ہے۔ اس کی وہ لکڑ سکڑ دادیاں پائینر عورتیں جنہوں نے سخت کوشی کی زندگی گزار کر نئے ملک کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ پائینر اسپرٹ ان کو ورثے میں ملی ہے۔ علاوہ ازیں امریکہ کی انتہائی مقابلہ

پرست زندگی نے ان کے اندر جارحانہ خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔

آیووا سٹی سے اور سیڈر ریپڈز سے کافی لوگ ہفتے میں پانچ دن کام کرنے بذریعہ ہوا شکاگو جاتے آتے ہیں۔ ویک اینڈ میں اپنی بوٹ کار کی چھت پر رکھ کر اسی ایفی شنسی سے برائے تفریح کسی جھیل کی طرف نکل گئے۔ دو موٹریں اور ایک کشتی مڈل کلاس کنبے کی نشانی ہے۔ غریب غربا محض ایک کار سے گذارا کر لیتے ہیں۔

شکاگو سے دوسرا طیارہ بوسٹن کے لئے پکڑا۔ بوسٹن میں پوپ کی آمد کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور بارش ہو رہی تھی۔ بوسٹن کی کھاڑی پر بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ یہاں دو سو سال قبل انہوں نے چائے سمندر میں پھینکی تھی اور انگلستان سے سیاسی محکومیت کے انقطاع کا اعلان کیا تھا۔ لیکن نیو انگلینڈ آج تک اپنی برطانوی روایات اور باقی امریکہ کے مقابلے میں اپنی برتر تہذیب پر نازاں ہے۔ لطیفہ مشہور ہے کہ بوسٹن کے پرانے خاندان اپنا شجرہ نسب پلگرم فادرز سے ملاتے ہیں۔ یہاں کی مشہور عالم یونیورسٹیاں سترہویں صدی میں قائم ہوئی تھیں اور اس خطے کی ارسٹو کریسی کو امریکن پریس "بوسٹن برہمن" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

بوسٹن سے تیسرا دمان برائے برلنگٹن جو کینیڈا کی سرحد کے قریب ریاست ورمونٹ کا شہر ہے۔ نیچے مشرقی ساحل کے حسین جنگلات فال کے رنگوں سے جھلملا رہے تھے۔

"کیا تم بھی خزاں کے رنگ دیکھنے جا رہی ہو؟" میرے برابر بیٹھی ایک ضعیفہ نے دریافت کیا۔ وہ دُور دراز سیٹیل سے آ رہی تھی۔

"محض حسنِ اتفاق سے یہ فال کا موسم ہے جب اپنے رشتہ داروں سے ملنے جا رہی ہوں۔ وہ لوگ وہاں پاکستان سے آئے ہیں۔"

"اوہ ۔ پے کیسٹین ۔" ضعیفہ ذرا مبہم نظر آئی۔

ابھی ایران کے یرغمالیوں کا قصہ نہیں ہوا تھا جس کے بعد سے "اسلام" اور

اسلامی ممالک کا پرچا امریکن ٹیلیویژن پر شروع ہوا۔ چند سیکنڈ غور و خوض کے
بعد ضعیفہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
"تم عرب ہو؟"
"انڈین"
وہ پھر بڑی مشکل میں گرفتار نظر آئی۔ ریڈ انڈین کو امریکہ میں محض انڈین کہا جاتا ہے
"انڈیا" مَیں نے اکتا کر کہا۔
"اوہ" اس نے اطمینان کا سانس لیا۔
"ہندو۔ ہیری کرشنا HARRY KRISHNA میری ایک پڑوسن کا لڑکا ہیری
کرشنا ہو گیا ہے۔ مگر تم کا سرخ مارک نہیں لگاتیں ماتھے پر؟"
"نہیں"
اب کون اس بے چاری سے مغز کھپائے۔ مَیں نے اس کو مناظرِ قدرت کی طرف
متوجہ کیا۔
آہا ہا۔ وہ دیکھئے کس قدر خوبصورت ہیں؟"
"واقعی" بڑھیا نے کھڑکی سے جھانکا۔ لیکن سوالات سے باز نہ آئی۔
طیارہ نیچے اُترنے لگا۔ باہر آکر ضعیفہ میرے ساتھ ساتھ رہی۔
"ارے وہ دیکھو۔ ایک سفید بالوں والی ہندو لیڈی بیوٹی فل اور رنگیل لبا
پہنے۔ یہی تمہاری کزن ہیں؟ اتنی خوبصورت جوان چہرہ اور سفید بال۔ اور ان کے
ساتھ ایک بے حد ہینڈسم نوجوان کھڑا ہے۔ فرنچ کٹ داڑھی۔ بالکل اطالوی مع
ہوتا ہے۔ یہی ان کا انجنیئر لڑکا ہے۔ جو برلنگٹن میں رہتا ہے۔ جس سے ملنے وہ پہ
کیسٹن سے آئی ہیں؟ وہ دیکھو وہ دونوں تمہیں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے ہیں"
جتنی دیر میں قطار میں منتظر رہی ضعیفہ نے جو مجھ سے آگے کھڑی تھی اپنی ز

منسٹری جاری رکھی۔

چچا زاد بہن آپا حمن (بیگم حمیرا جری احمد سید ملاحظہ ہو "کارِ جہاں دراز ہے" جلد دوم) کے فرزند اکبر عمر عزیز سید عرف منن (ملاحظہ ہو کتاب ہذا) آج سے تیئس سال قبل بعمر سترہ سال لاہور سے بغرض تعلیم لندن بھیجے گئے تھے جب سے مغرب میں قیام پذیر ہیں۔ اور اب برلنگٹن کی آئی۔ بی۔ ایم فیکٹری میں CHIPS ڈاک کے ٹکٹ کے برابر کمپیوٹر) کی مشنری ڈیزائن کرنے والے انجینئروں کی ٹیم میں شامل برلنگٹن سے چند میل دور ایسیکس جنکشن نامی قصبے میں مقیم۔

امریکہ کی ہر ریاست ایک تخلص بھی رکھتی ہے۔ مثلاً اری زونا "گرینڈ کینین اسٹیٹ"۔ الینوئے "بہترین مواقع کی سرزمین"۔ کیلی فورنیا "گولڈن اسٹیٹ"۔ ڈیلاویر "ڈائمنڈ اسٹیٹ"۔ فلوریڈا "سن شائن اسٹیٹ"۔ جارجیا "ایمپائر اسٹیٹ آف دی ساؤتھ"۔ کینسس "آفتاب"۔ کینٹکی "نیلی گھاس"۔ مین "صنوبر"۔ منی سوٹا "شمالی ستارہ"۔ مسسپی "منگولیا"۔ نیوادا "سلور اسٹیٹ"۔ نیو جرزی "گارڈن اسٹیٹ"۔ نیویارک "ایمپائر اسٹیٹ" (ایمپائر یعنی اوّل) ٹیکسس "تنہا ستارہ"۔ واشنگٹن "سدا بہار" وغیرہ وغیرہ۔

منن کی کاروں کی تختیوں پر "گرین اور ٹیلن اسٹیٹ" لکھا تھا جو ریاست درمونٹ تخلص ہے۔ جنت نظیر درمونٹ اپنے سرسبز پہاڑوں جھیلوں اور بالخصوص موسم (خزاں) کے رنگ برنگے پتوں والے درختوں کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔

"اللہ میاں نے مغربیوں کو جی بھر کر ہر طرح سے مالا مال کیا۔ ایک سے ایک خوبصورت ۔۔۔ اور ہمیں اٹھا کے دے دیئے ریگستان۔" آپا حمن نے دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے

منن کی امریکن بیوی نینسی مہمان نوازی میں مصروف کمرے میں آئی۔ جیسے مجھے عمر

نے بتایا کہ اس کی والدہ چند ماہ کے لئے پاکستان سے آ رہی ہیں۔ مَیں سہم گئی کہ ایک تو ساس پھر پاکستانی۔ مشرقی مسلمان ساس جانے کیسی ہوں گی۔ دیکھا تو ایک نہایت اسمارٹ موڈرن بہترین انگریزی بولنے والی خاتون مسکراتی ہوئی، ہوائی جہاز سے اتریں۔ عمر نے مجھے بتایا کہ اماں اور ان کی بہنوں نے ۱۹۲۰ء میں ایک کانونٹ اسکول میں پڑھا تھا اور ۱۹۳۹ء میں بی اے پاس کیا تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ہندوستان میں مسلمان عورتیں اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ ہو چکی تھیں"۔

اس لکڑی کی پوپخ والے نقاب اوڑھے عرب عورتوں نے یہاں آ کر مسلمان عورتوں کے متعلق مغرب کے اسٹریو ٹائپ تصورات کو مزید تقویت بخشی ہے اور خصوصاً اب وہ ٹیلی ویژن فلم" ایک شہزادی کی موت" گویا اس تابوت کی آخری کیل ہے۔

آپا حمن کے سگے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید صلاح الدین حیدر پارسے میاں (ملاحظہ ہو" کارِ جہاں دراز ہے" جلد اوّل دوم) صدر شعبہ کمپیوٹر ٹیکنولوجی مک گل یونیورسٹی مونٹریال موجد اردو فارسی، عربی، سکرپٹ بیز ٹائپنگ مشین "حیدر سسٹم" کہلا رہی تھی۔ مونٹریال سے وارد ہوئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک اور بڑا پیچیدہ ہے۔ اسلامی تجدیدیت اور اس کے ساتھ مغرب کی ایجادات کا پورا پورا استعمال۔ اسی سال سے سعودی حکومت نے پارسے کا حیدر سسٹم خرید کر اسے جدہ میں حاجیوں کے انتظام کے لئے استعمال کیا۔

یہودی۔۔ مسیحی مغربی تہذیب کے سائنسی اور ٹیکنولوجیکل کارناموں سے بہرہ اندوز ہونے کے ساتھ ان میڈیول معاشروں میں جو ہلچل مچی اس کا نتیجہ ایران میں سامنے آ چکا تھا۔ اور عرب ممالک ایک بحران سے کسی لمحے بھی دو چار ہو سکتے تھے شہزادی اور اس کے عاشق کا قتل اسی بحران کا ایک پہلو تھے ہم لوگ جو ڈیڑھ

سال سے برطانیہ کی نوآبادی رہے اس اچانک بحران کا سامنا کرنے کے
ئے ان تبدیلیوں کے اثرات کو بتدریج جھیل گئے۔ نظریاتی اور تہذیبی
م کا سامنا ہوشمندی سے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے سو سال قبل کیا
خلیجی اور سعودیہ عرب اس ٹکراؤ سے آج دوچار تھے۔ اور خلائی عہد کا قرونِ
کی دنیا سے یہ ٹکراؤ خوفناک اور لرزہ خیز تھا۔
مغربی ٹیکنولوجی ہماری زندگیوں کا ایسا لازمی حصہ بن گئی ہے کہ ہم اس کے
ں سوچتے بھی نہیں۔ مرزا غالب کلکتہ میں صاحبانِ فرنگ کے کمالات دیکھ کر
شتِ بدنداں رہ گئے تھے۔ آج مرزا غالب کے ٹیپ ساری دنیا میں جہاں
ہندوستانی پاکستانی موجود تھا گھر گھر بج رہے ہیں۔
رات کو آپا حمن نے اپنی بڑی لڑکی نازلی کے گیت بجائے۔ مرزا غالب کی
نازلی اور اس کے شوہر کے گھر پہ دعوتوں میں یہ گاتے ٹیپ کئے گئے تھے۔
جی افسر نے سہگل الاپا۔ دیا جلاؤ۔ سنت سہاگن بن رہی تیرے مندر میں
بیرا۔"
انم خاناں۔ اب آپ۔" ایک اور افسر کی آواز آئی۔ نازلی کا شوہر آپا نفیسہ
بیگیڈیر مجاہد حسین اس چھاؤنی کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ سازوں کے ساتھ نازلی کی
از بلند ہوئی۔

ازنگا تیری یاد میں نین ہوئے بے چین۔ وہ ہوا کا بھولان وہ پیپل کی چھاؤں"۔
یونٹ کے رنگ برنگے خزاں زدہ درختوں میں گھرے منی کے دو منزلہ مکان
ں امریکن ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے پیارے کو امبوا اور پیپل کا خیال آیا ہوگا
نے ظاہر نہیں کیا۔ اپنی نو عمری میں پیارے ہماری فیملی میوزک پارٹیوں کے
ں رہ چکے تھے۔

"پیارے انداز کا وہ گانا سناؤ جو تم گاتے تھے۔ میری لاڈلی بنی ہے تاروں کی تورانی ۔ یا وہ ۔۔۔ اٹھائے جا ان کے ستم اور جیئے جائے" میں نے فرمائش کی" تم اور رمی یہ گانے ہمیشہ گاتے تھے۔"

"بی بی" پیارے نے سادگی سے جواب دیا" عرصے سے ہم گنگنائے تک نہیں ۔ اگر گاتے بجاتے رہتے تو یہ ایجاد نہ کر پاتے ۔ کسی اہم کام کی تکمیل کے لئے یکسوئی چاہیئے۔"

پیارے میاں نا رتھ امریکن ورک ایتھک کی درخشندہ مثال بن چکے تھے۔

لاس اینجلز سے میرے بھتیجوں جلال عدنان اور منصور نے فون کیا" ورمونٹ میں فیملی ری یونین بڑے زوروں میں جا رہا ہے۔"

سان فرانسسکو سے بھانجی زیبا کی آواز آئی۔ امریکہ میں "نیوکلیر فیملی" محض شوہر بیوی اور بچوں پر مشتمل ہے۔" یہاں سب کچھ ہے بس ہیومن ریلیشن شپ ختم ہو گئے" میں نے کہا" گو سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ ہم لوگ نے مشرق میں اب تک کیا تیر مار لئے ۔ بڑے کھاٹ پر پان چبا رہے ہیں اور سمدھی کے سالے یا پھوپھی کی نند کی جیٹھانی سے گپ ہو رہی ہے ۔ ان لوگوں نے انفرادی آزادی کی وجہ سے ہی یہ PRAN بنا لیا ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ چپ اگر نہ بنتا تو کیا حرج تھا" میں نے میز پر پڑے ڈاک کے ٹکٹ کے سائز کے کمپیوٹر کو دھیان سے دیکھ کر سوال کیا۔

شدید انفرادیت پرستی اور دوسرے شخص کی ۔۔۔ PRIVACY کا احترام اور اپنے کام سے کام رکھنا مغربی تہذیب کی خصوصیت ہے ۔ اور شدید خود اعتمادی بقول شخصے ہر امریکن مجسم منشور آزادی بنا پھرتا ہے ۔ اسی انفرادیت پرستی کی وجہ سے اس قوم نے اشتراکیت اور اشتمالیت کو ہوّا بنا رکھا ہے "خوشحالی" تحفظ او

آزادی" "امریکن" خواب" کے اجزاء ہیں۔ اور بوڑھوں کی خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ نینسی کی والدہ پچھتر سالہ بزرگ خاتون ماشاءاللہ واشنگٹن ڈی۔ سی سے کار خود ڈرائیو کرتی اتنا لمبا فاصلہ تنہا طے کر کے بیٹی اور داماد سے ملنے آئیں۔ اور تیسرے دن واپس۔

پارے کے خسر دوسری جنگِ عظیم سے قبل برطانیہ میں لیتھوانیا کے سفیر تھے جنگ کے بعد لیتھوانیا سویٹ یونین میں شامل ہو گیا۔ وہ وطن واپس جانے کے بجائے کینیڈا آگئے۔ وہ میاں بیوی مونٹریال میں رہتے ہیں جب کبھی بیٹی اور داماد سے ملنے آتے ہیں پارے کی بیوی ڈائنا باضابطہ شام کا لباس پہن کر کوک ٹیلز سرو کرتی ہیں۔ ڈنر کے بعد کچھ دیر پُر تکلف گفتگو ہوتی ہے۔ اس کے بعد ماں باپ واپس۔ ایک ہمارے ہاں کا نقشہ ہے۔ کہ ہفتوں مہینوں عزیز و اقارب اور دوست ایک دوسرے کے ہاں پلنگوں پر نیم دراز گھنٹوں مسلسل گپ ٹھونک رہے ہیں۔ بلا اطلاع بن بلائے ایک دوسرے کے ہاں پہنچ گئے اور مسلسل گپیں اس قسم کی قبائلی اجتماعی بے تکلف طرزِ زندگی کا مغرب میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ اسی وجہ سے انہوں نے CHIP ایجاد کر لیا اور ہائی ٹیکنولوجی کے دوسرے معجزنما گل پرزے اور اسی وجہ سے فرد کی تنہائی کا احساس بڑھ گیا۔ پہلے وہ ماہرینِ نفسیات کے پاس جاتے تھے۔ اب ہمیش یوگی کے چکر میں مبتلا ہوئے۔

چنانچہ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ہمیں کھاٹ پہ نیم دراز ہو کر چچی کی نواسی کی نند کے ساتھ ضرور گپیں ہانکنی چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"ہم لوگوں کے مشترکہ خاندان کی روایت کو یہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے۔" آپا حسن دلیں۔ "بہشتو رہیں یا بعض جگہ کبھی پورا خاندان جمع ہوتا کس قدر تفریح رہتی تھی۔ ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ میں آٹھ نو سال کی تھی مگر اچھی طرح یاد ہے گویا کل کا واقعہ ہو۔ سب سے پہلا فیملی فینسی ڈریس ہوا مجھے یاد ہے سب میرٹھ میں جمع تھے۔ امی جان کمہارن

بنیں۔ ابا جان کمہار، چھوٹی چچی جان بہشتی۔ بڑے ابا بڑی اماں جوگی جوگن تھے۔ جس کے لئے ستار کسی ہندو دوست کے ہاں سے منگوایا گیا تھا وہ وقت پہ پہنچا۔ چچا ڈاکٹر رحید مرحوم نے فی البدیہہ یہ نظم کہی۔ اب بھلا دیکھو۔ ورمونٹ ہیں کہ مجھے وہ بھولی بسری نظم یاد آئی جو بالکل ایک دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہے

بیچنے نکلی کمہارن جب کھلونے رات کو
دل دھڑکتا تھا موٹر پر کمہار آنے کو ہے
اک طرف جوگی ہے حیراں اک طرف جوگن ملول
سارے ساماں ہو گئے لیکن ستار آنے کو ہے
بھائی صاحب کو پریشانی میں ہوتے یاد ہیں
ڈاکٹر کا روز وعدہ ہے چمار آنے کو ہے
تائی ادریسن بہاؤالدین سے بولیں کہ لو۔
جانِ من بستر پہ جاؤ اب بخار آنے کو ہے

ڈاکٹر یعنی "ڈاکٹر چچا وحید۔"

"شدید انفرادیت کا ایک ردِ عمل یہ ہوا ہے کہ کچھ لوگ کمیون بنا کر دیہات میں رہنے لگے ہیں۔" منتق نے کہا۔

یہاں شخصی آزادی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کسی ذیلی کلچر یا کسی متبادل طرزِ حیات کو بلا روک ٹوک اختیار کر سکتے ہیں۔ آپ کوئی سا مذہب اختیار کر لیجئے۔ کسی طرح کے کپڑے پہنیے۔ جو چاہے کیجئے۔ اگر آپ پبلک نیوسنس نہ بنیں کوئی آپ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔

ایک رات منتق کی چالیسویں سالگرہ کا ڈنر تھا۔ امریکن دستور کے مطابق ڈنر روزانہ شمع کی روشنی میں کھایا جاتا تھا۔ اس رات نینسی نے سالگرہ کی شمعیں روشن کیں اور تحفے کھولے گئے۔ ایک تحفہ منتق کے سیاہ بلے کی طرف سے برآمد ہوا۔

"ٹونک میں اکتوبر ۱۹۳۹ء کی اس رات جب منّن پیدا ہوئے کیا معلوم تھا کہ اس بچے کی چالیسویں سالگرہ ہم امریکہ کے ایک قصبے میں منائیں گے۔" آپا حمنؔ بولیں۔

"ہر چیز پہلے سے لکھی جا چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "روشن کتاب میں۔"

"کمپیوٹر کیا کیا حل کر سکتا ہے؟" آپا حمنؔ نے پوچھا۔

"کیا پتہ زندگی کا معمہ بھی حل کرے۔ اگلے دس سال میں۔ آج سے تیس سال پہلے ایک کمپیوٹر کا سائز اس کمرے کے برابر ہوتا تھا۔ اس وقت یہ ڈاک کے ٹکٹ کے برابر ہو گیا ہے۔ محض دس سال میں اتنی زبردست ترقی تو آگے نہ جانے کیا کیا ہو سکتا ہے؟" منّن نے جواب دیا۔

"یہی تو سوچ کر ڈر لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"پیارے ماموں نے جو مشین ایجاد کی ہے اسے وہ دیا سلائی کی ڈبیا کے سائز کی بنانے والے ہیں۔" منّن نے مزید اطلاع دی۔

منّن کا امریکن دوست جیری پرشین آرٹ کی کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔

"یہ عمارتیں جوان حیرت انگیز لوگوں نے بنائیں آٹھ سو سال پہلے۔ یہ لوگ جدید ٹیکنولوجی اور جدید انجینئرنگ سے واقف نہ تھے۔"

متحیر و مبہوت وہ اوراق پلٹا کیا۔

"اسلامک آرٹ پر کتابیں یہاں کوئی خریدتا نہیں۔ ہم خرید لاتے ہیں۔ یہاں اسلامی تہذیب سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ ہندو فلسفے یوگا پر کتابیں البتہ دھڑا دھڑ بک رہی ہیں۔" منّن نے کہا۔

"اسلامی تہذیب سے دلچسپی کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ اسلام آج کل محض اس سلسلے میں مشہور ہو رہا ہے کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ اس کا سر قلم کر دیا۔

اسے گولی سے اڑا دیا۔ اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ میں نے جل کر کہا۔

...:...

سارا نیو انگلینڈ دنیا کے حسین ترین خطوں میں سے ہے اور اس کے موسم خزاں کے ہزار رنگ دیکھنے کے لئے ساری دنیا کے سیاح وہاں آتے ہیں۔ درختوں کے کاسنی اودے نارنجی عنابی سرخ سنہرے پتے ایک عجیب و غریب نظارہ ہے۔ خوبصورت گاؤں پینٹنگز معلوم ہوتے ہیں۔ اور رنگ برنگے پتوں والے شاندار بلند و بالا سایہ دار درخت آبی رنگوں کی سبک تصویریں۔

ایک پہاڑی کے اوپر پڑوسی کینیڈا کے سیاحوں کی کاریں جمع تھیں۔ نشیب میں حسین دیہاتی مکانات، گرجا گھر، کنٹری اسٹور، سلسلہ کوہ پر اور وادیوں میں نارنجی عنابی اودے کاسنی قرمزی ارغوانی پتوں والے شاندار درختوں کے جنگل، اتنا قدرتی حسن یکجا ہونا ممکن ہے۔ وادی کشمیر کی طرح۔ وہاں غربت ہے یہاں بے اندازہ دولت کوئی اللہ کا بندہ پیدل چلتا نظر نہ آیا۔ بہار ہو کہ خزاں حسن سریع الزوال ہے۔ دس دن کے اندر اندر بیت جھڑ کے رنگ کہیں کہیں مرجھا چلے۔

آپا حسن پاکستان لوٹ رہی تھیں میں واپس آئیو واسٹی۔ صبح سویرے ہم لوگ نیویارک روانہ ہونے والے تھے۔ رات کو چاندنی چھٹکی۔ درختوں کے رنگ چاند کے رنگ میں نہائے۔ محبت شعار نینسی اداسی کے ساتھ راستے کے لئے ناشتے کے باسکٹ تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ آپا حسن نے نازلی کا ٹیپ لگایا۔ اس کی آواز جو بہت دور ملتان چھاؤنی میں ایسی ہی کسی اداس چاندنی رات میں ریکارڈ ہو گی بلند ہوئی۔

نظر سے چھپ رہا ہے ماہتاب آہستہ آہستہ
بکھر جائے نہ سارا شہر خواب آہستہ آہستہ

صبح منہ اندھیرے منّی نے اسٹیشن ویگن اسٹارٹ کی ۔ نینسی نے خدا حافظ کہا۔
آپا حمن نے آنسو خشک کئے ۔ کار ٹرپیکر فضا ایسیکس جنکشن سے نکل کر سپر فضا شاہراہ پر آگئی —

برس جائے گا نظروں کا سحاب آہستہ آہستہ
کھلے گی پھر سے یادوں کی کتاب آہستہ آہستہ

جیری اور منّی باری باری ڈرائیو کر رہے تھے ۔ چھ سو میل کا حسین راستہ ، عظیم الشان
— شاہراہوں پر کاروں کی قطاریں ۔ دونوں طرف سرسبز پہاڑ ۔ رنگ برنگے جنگل ،
خوبصورت شہر اور گاؤں —— ایک جگہ وسیع سبزہ زار کے اوپر ایک غبارہ بہت
نیچے نیچے جا رہا تھا ۔

"دل جلے لوگ" منّی نے کہا ۔ "آج کل غباروں میں سفر کر رہے ہیں ۔ ایک غبارہ
پچاس ہزار ڈالر کا مل جاتا ہے ۔ خریدنے والے خرید لیتے ہیں ۔"

نیو یارک شروع ہونے سے قبل کروڑ پتیوں کے مکانات گھنے باغوں میں پوشیدہ ۔
اس کے بعد اچانک سلمز ۔ جلی ہوئی دھواں دھار عمارتیں اب تک امریکہ میں ہر شہر اور قصبہ
اس قدر صاف ستھرا دیکھا تھا ۔ ایک سڑک پر پڑا ذرا سا کاغذ کا ٹکڑا دیکھنے کو آنکھیں
ترس گئی تھیں ۔ اب راستوں کے کنارے کوڑے کے ڈھیر بھی نظر آئے ۔ دفعتہً یہ
محسوس ہوا کہ نیو یارک میں انسان بستے ہیں ۔

"آپا حمن —— وہ دیکھئے کوڑے کا ڈھیر ——" میں اکسائیٹ منٹ سے کہتی ۔
"ہاں ، ہاں اور وہ دیکھو ۔ اتنا کوڑا ادھر پڑا ہے ۔" وہ جواباً کہتیں ۔
"یہ عمارتیں کیسے جل گئیں ؟" ایک پل پر سے گذرتے ہوئے میں نے پوچھا ۔
"یہودی مسلم لینڈ لارڈ اپنے بلیک کرایہ داروں کو نکالنے کے لئے آگ لگا دیتے
ہیں ۔" جیری نے بتایا —— !

اقوام متحدہ کی عمارت دور سے ماچس کی ڈبیا معلوم ہوئی ۔ بارش شروع ہو گئی ۔

ہڈسن دریا دھند میں چھپ گیا۔" ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ" بادلوں میں پوشیدہ تھی۔
شام کو شہر کے ورکنگ کلاس علاقے میں ہم لوگ ایک ہندوستانی دکان کا پتہ ڈھونڈتے پھرے جو آپا جمن کو کسی نے واشنگ مشین خریدنے کے لئے بتایا تھا۔ ایک جگہ ایک بورڈ پہ پردیپ یا جگدیپ اسی نام کا کوئی بورڈ لکھا تھا۔ ایک صاحب دروازے میں کھڑے تھے۔ میں ان کو بمبئی کا گجو بھائی سمجھی۔ وہ کٹر پاکستانی مسلمان نکلے۔ خاصے بدمزاج بھی تھے۔ میں نے پوچھا۔

"آپ نے دوکان کا یہ نام کیوں رکھا ہے؟"
بولے" یہ بزنس ہے"

یہ منطق میری سمجھ میں نہ آئی۔ باہر سائیڈ واک پر چند غریب یہودی پھیری والے ترکاری کے ٹھیلوں کا باقیماندہ سامان سمیٹ رہے تھے۔ وہ شمالی غریب نیویارک کے یہودی تھے۔ گل موچھے۔ سر پہ ٹوپیاں۔ آپس میں جھگڑ بھی رہے تھے۔ بڑا اداس منظر تھا۔

...

کزن حسین کی سسرال نیویارک کے شمالی امیر یہودی ہیں۔ سنٹرل پارک ویسٹ میں رہتے ہیں۔ جو نیویارک کا بے حد مہنگا محلہ ہے۔ شہر سے باہر ان کی کنٹری اسٹیٹ، اور ذاتی جھیل ہے۔ ان دنوں حسین اپنی سسرال میں مقیم تھے۔

جس وقت ہم لوگ سنٹرل پارک ویسٹ پہنچے، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ حسین کی عمارت کے پورٹیکو میں وردی پوش دربان استادہ تھا۔ داخلے کا عالی شان مرمریں ہال عظیم الجثہ تازہ پھولوں سے بھرے مرمریں گلدانوں اور سنہرے صوفوں سے آراستہ۔ دو دیں گیلری، منقش سنہرے بھاری لفٹ دوسرے وردی پوش چوبدار نے اوپر حسین کو فون کیا۔

اوپر شاندار فلیٹ۔ ڈرائنگ روم میں گرینڈ پیانو۔ گیلری میں حسین نے اپنے ماموں

کی تصویر لگا رکھی تھی کہ محلّہ سادات نہٹور میں نیم تلے کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ گڈ اولڈ حسین۔

حسین اور ان کی بیوی لینڈا نے چند سال قبل خاندان نہٹور کی اپنی شاخ کے پاکستان انخلاء کے بارے میں ایک ناول بعنوان "ریفیوجی" لکھا تھا۔ جو نیویارک سے چھپا۔ برصغیر کے مسلم معاشرے کے متعلق پہلا ناول تھا۔ نہایت عمدہ ریویو ہوئے۔ لینڈا کے والد مسٹر فیلڈمین نیویارک کے ایک معروف وکیل تھے۔ چند روز قبل انتقال ہُوا تھا۔ مسز فیلڈمین کمرے میں آئیں۔ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی (امریکن یہودی عموماً خوش شکل ہوتے ہیں۔) ہم لوگوں نے تعزیت کی۔ اچانک لینڈا نے مجھ سے کہا "میرے والد نہٹور میں دفن ہیں۔"

"نہٹور میں۔ ؟" مَیں نے تعجب سے دہرایا۔

"وہ ڈپریشن میں مبتلا تھے۔ چُپ سی لگ گئی تھی۔ تبدیلیٔ آب و ہُوا کے لئے حسین ان کو دلّی لے گئے۔ شیرٹن میں ٹھہرے۔ وہاں پہلی مرتبہ والد نے خوش ہو کر چاروں طرف دیکھا اور مہینوں بعد پہلی مرتبہ بات کی۔ کہنے لگے۔

"یہ ہوٹل مجھے بہُت پسند آیا۔ کیا مَیں اسے سِلویا کے لئے خریدلوں ؟" سِلویا میری اماں کا نام ہے۔ پھر چُپ سادھ لی۔ چند روز بعد حسین ان کو نہٹور لے گئے۔ چچا شمیم حسین زیدی کے ہاں ٹھہرے۔ سارا محلّہ جمع ہو گیا۔ سارے رشتہ دار ان کی تیمارداری میں لگ گئے۔"

اب حسین بولا۔ "مسٹر فیلڈمین کے لئے اس نوعیت کا اجتماعی خلوص اور مہمان نوازی انوکھی چیز تھی رات کو ان کا پلنگ صحن میں بچھایا گیا۔ تاروں بھرا آسمان بھی اس قسم کا پہلے نہ دیکھا تھا۔ چُپ رہے اتنا بولے کہ ان ستاروں سے فرشتے اُتر رہے ہیں۔ تیسرے دن انتقال کیا۔"

"کفن دفن کے لئے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔
لنڈا نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک مولوی صاحب نے قرآن شریف کی حضرت موسےٰ کے متعلق چند آیات پڑھ دی تھیں۔ لیکن حسین اسی وقت آپا جمن سے کہہ رہا تھا۔" بابا وہاں کہاں سے ملتا۔ میں نے ایک کیتھولک پادری دارجیلنگ سے ہوائی جہاز پہ منگوایا۔"
حسین کی عادت ہمیشہ سے گپ ٹھونکنے کی ہے۔ میں نے اس سے یہ نہ کہا کہ نزدیک کے قصبہ تاجپور ریانوتے میل دور دلی سے کوئی پادری آسکتا تھا جو عہد نامۂ قدیم پڑھ دیتا۔ دارجلنگ سے کیوں بلوایا گیا۔ مگر کوئی ایسی گپ چھوڑتے وقت حسین کو ٹوکنے سے اس کے اسٹائل میں فرق آجاتا ہے۔
"مسٹر فیلڈین کی موت کی خبر سن کر امریکن سفیر دلی سے تعزیت کے لئے نصور آنا چاہتے تھے۔ مگر میں اسی روز دلی واپس آگیا۔ مسٹر فیلڈین کو اپنے دادا جان کے مزار کے پہلو میں سپردِ خاک کیا ہے۔" حسین نے بات ختم کی۔
ہم سب چپ ہو گئے۔ موت زندگی کی طرح ناقابلِ یقین ہے۔

...:..

ہم لوگ نیویارک سے باہر وائٹ پلینز میں ہولی ڈے اِن میں ٹھہرے تھے۔
ایک رات بارہ بجے کے قریب سنسان ہارلم میں سے گذر رہے تھے۔ "یہ تو بہت خطرناک جگہ ہے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔
"وہ دیکھئے وہ سامنے جو پُراسرار آدمی جا رہا ہے وہ ضرور مافیا کا ہے۔" منّی نے ڈرانا شروع کیا۔
"اور وہ لڑکی دراصل خفیہ ایجنٹ ہے" جیری بولے۔" وہ ریستوراں کے دروازے میں جو لوگ کھڑے ہیں، وہ لگتا ہے ابھی گولیاں چلا دیں گے۔"
نیویارک خطرناک ہے۔ اقتصادی سماجیاتی وجوہ کی بنا پر۔ زیادہ تر جرائم

پیشہ یا کالے ہیں یا ہسپانک ہارلم کے کالے سیلمز میں رہنے والے کالے۔ ادیب۔ مغنی۔ موسیقار۔ مقبول ٹی وی فنکار۔ نیوز کاسٹرز۔ افریقہ میں اپنی جڑیں تلاش کرنے والے مغرور کالے دانشور۔ (امریکن حبشی اب اپنے آپ کو بلیک کہلواتے ہیں کہ لفظ نیگرو میں تحقیر کا رویہ مضمر ہے) اس گوری دنیا کے پہلو بہ پہلو مردم چشم زدہ یعنی وہ کالی دنیا موجود ہے جس کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں۔

نادیا۔ لیلیٰ۔ فاطمہ

جب آپا حسن۔ منن اور جیری لاگارڈیا پر ایکسرے والے دروازے کے اِدھر کھڑے رہ گئے اور مَیں براہِ شکاگو اور سیڈر ریپڈز آیووا سٹی میں فلاور اپارٹمنٹس چوتھی منزل پر اپنے گھر واپس پہنچی۔ باورچی خانے سے ایک سقف شگاف قہقہے کی آواز آئی۔ مَیں دروازہ کھول کر اندر گئی۔ ایک اجنبی کالی لڑکی ڈیوٹی کی ڈیوٹی میز پر بیٹھی بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ نادیا کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔

"ہلو۔ مَیں فاطمہ ڈیکے ہوں۔ جنوبی افریقہ سے آئی ہوئی ہوں۔ اتنے دنوں بعد پہنچی کیونکہ پاسپورٹ مشکل سے بنا۔ (قہقہہ) راستے میں نیو یارک ٹِک گئی تھی۔"

فاطمہ کا پلے وہاں — DEF BROADWAY پروڈیوس ہونے والا ہے۔" نادیا نے کہا۔

"اور یہ اپنے ملک سے پہلی بار باہر آئی ہے۔" فاطمہ نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ "اگر تم نے نیو یارک کے ٹائمز اسکوائر میں رات کے دو بجے ایک کالی لڑکی کو نشے میں آؤٹ تنہا چور اہے پر گھومتے ہوئے دیکھا ہو گا تو وہ مَیں ہی تھی۔" فاطمہ نے کہا۔

"فاطمہ اسکوائر میں آدھی رات کو تنہا؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "تم کو ڈر نہیں لگا؟"

"ڈر؟ میں جنوبی افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ مجھے کاہے کا ڈر۔ ہم سخت جان لوگ ہیں۔ میرا ایک بھائی جیل میں ہے۔ ایک مارا جاچکا ہے۔ چھری پیٹی میں رکھ کر نکلتی رہی ہوں۔ میں سارے نشے کر چکی ہوں ابھی رائل کورٹ لندن میں میرا ایک ڈرامہ پروڈیوس ہونے والا ہے تم دیو متمدن خواتین زندگی کے حقائق کے متعلق کیا جانو۔ اور یورپ کی نستعیق لیلیٰ اربل میری پڑوسی ہے وہ مجھے سمجھ ہی نہیں پاتی۔ شاید تم بھی مجھے وحشی تصوّر کرو۔" ایک اور قہقہہ۔ اچانک کھڑے ہو کر ایک مکالمہ شروع کر دیا۔ پھر قہقہہ لگایا "یہ میرے ایک ڈرامے کا حصّہ ہے۔ میں اپنے ڈراموں میں خود ایکٹنگ کرتی ہوں۔" ایک اور قہقہہ۔ جیسے وہ ساری دنیا کو چیلنج اور ڈیفائی کر رہی ہو۔ صبح کو لیلیٰ اربل بولی۔ "میں بہت ہراساں نظر آئی۔

"فاطمہ عجیب بے تکی لڑکی ہے۔ کچن میں طوفان بدتمیزی پھیلا رکھا ہے۔ رات کے دو دو بجے شہر سے لوٹ کر آتی ہے۔ پھر زور زور سے فون پر باتیں کرتی ہے۔ اونچے قہقہے لگاتی ہے۔ میرے اعصاب پر اثر ہو رہا ہے۔"

میرے اور نادیا کے باورچی خانے کی طرح لیلیٰ اور فاطمہ کا باورچی خانہ مشترکہ تھا۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی بے حد غلط پڑوسنیں تھیں۔ نیم یورپین لیلیٰ پُرسکون خاموش ثقہ۔ فاطمہ جنوبی افریقہ کی ایک طوفانی مسلم چائیلڈ۔ لیلیٰ جتنی حسین تھیں، فاطمہ پیٹ بھر کر اتنی ہی بدصورت۔ قد آور۔ فربہ۔ تقریباً گھٹا ہوا سر (امریکن کالی لڑکیاں بھی آج کل اپنا سر منڈا رہی ہیں) موٹے شیشوں کی عینک۔ تنگ جینز میں ملبوس پہاڑ کی پہاڑ — اور بے حد پُرخلوص اور نٹری۔ چند روز میں لیلیٰ فاطمہ کی ہنگامہ خیز موجودگی کی عادی ہو گئیں۔ مذہباً فاطمہ عیسائی تھی۔

"میری ماں نے اپنی ایک مسلمان درزن دوست کے نام پر میرا نام رکھا تھا۔ میں کبھی کبھی گرجا ہو آتی ہوں" اس شام اس نے ہمارے کچن میں آکر دہاڑنا شروع کیا "تم اور نادیا میرے لئے مصری اور ہندوستانی کھانے تیار کرو۔ ورنہ میں تم دونوں کو مکھیاں بنا دوں گی" میں افریقہ کی جادوگرنی ہوں۔ میرا پردادا عیسائی ہونے سے پہلے اپنے قبیلے کا خوفناک ساحر تھا۔ ہو۔ ہو۔ پلاؤ تیار کرو ورنہ میں ابھی اپنا دوڈو چلاتی ہوں"

"میں فراعنہ کی اولاد ہوں۔ سحر تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں پہلے تم کو مچھر نہیں بنا دوں گی" نادیا نے جواب دیا۔

"اور تم بھولتی ہو کہ میں اس سے قبل تم دونوں کو کوّے بنا کر خود بذریعہ انڈین لیوریپ ٹرک غائب" میں نے کہا ـــــ اسی وقت چودھری محمد نعیم کا شکاگو سے فون آیا "کل صبح ـــ" انہوں نے کہا ـــ "ایرپورٹ پر جان ہنسن صاحب آپ کو موجود ملیں گے"

اندر کچن میں فاطمہ نے میز پر مکّہ مارا۔ اور چلائی "انڈین روپ ٹرک غائب"

"معاف کیجئے گا" میں نے چودھری صاحب سے کہا "وہ دراصل مصر اور جنوبی افریقہ کی ادیب خواتین ذرا اس وقت چند اہم ادبی مسائل پر مصروفِ گفتگو ہیں"

ہاہاہا۔ ہوہوہو۔ فاطمہ دہاڑا کی۔

ہواؤں کا شہر

چودھری محمد نعیم صدر شعبہ اردو نے شعبہ جنوبی ایشیائی علوم یونیورسٹی آف شکاگو کی طرف سے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر نادیا لشائی برائے سیر و تفریح ہمراہ چلیں۔ شکاگو اوہیر کے صدر دروازے سے نکل کر نوئمر جان ہینس صاحب (موصوف بھی آگ کا دریا پر مضمون لکھ چکے تھے۔ انہایت فصیح و بلیغ شستہ بامحاورہ اردو صحیح لہجے میں بولتے) جھیل مشی گن کے کنارے کنارے ہوٹل ونڈمیر کی طرف چلے۔

شکاگو کہ مستقل تیز ہواؤں کی زد میں رہتا ہے پچھلی صدی میں اسکائی اسکریپر سب سے پہلے یہیں تعمیر ہوئے۔

"محض شکاگو میں چھ یونیورسٹیاں۔ اس ملک میں ہر چیز بے تحاشا ہے۔" نادیا نے اظہارِ خیال کیا۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے کیمپس کے نزدیک پرانی وضع کے ونڈمیر ہوٹل میں میرے دریچے کے سامنے جنگل تھا جس میں صبح سویرے ایک خاتون ایک مختصر سے سفید کتے کی زنجیر سنبھالے ہوا خوری کرتی گذرتی تھی۔ صبح صبح ہوٹل کے اندر چھ سات بوڑھی عورتیں ہیروں سے لدی، میک اپ کئے دستانے پہنے برق رفتار لفٹ

سے اُتر کر نیچے لوبی میں صوفوں پر بیٹھ جاتیں اور سامنے سے گذرنے والوں کو گڈ مارننگ کہتیں ۔ اس امید پر کہ کوئی دو منٹ رُک کر ان سے بات کرے گا ۔ وہ سب دولتمند بیوائیں تھیں جن کی اولاد حسبِ قاعدہ ان کو اپنے ساتھ نہیں رکھتی یا لاوارث تھیں ۔ ان میں سے ایک ضعیفہ جس کی وہیل چیئر اس کی طویل القامت لیڈی کمپینین دھکیلتی تھی ۔ یہ لڑکی شکلاً یہودی معلوم ہوتی تھی ۔ اور وہ ضعیفہ لاوارث تھی تو یقیناً اس لڑکی کے نام اپنی دولت چھوڑ جائے گی ۔

یہ تنہا اُداس بڑھیاں آج سے نصف صدی قبل جوان لڑکیاں رہی ہوں گی ۔ اپنے شوہروں یا دوستوں کے ساتھ لگژری لائنرز پر یورپ کی سیاحت کے لئے جاتی ہوں گی ۔ آج کوئی بات کرنے کا روادار نہیں ۔ تفریح گاہوں میں ان کی جگہ اوروں نے لے لی ۔

شکاگو میں ان گنت تھیٹر ہیں ۔ اوپیرا، بیلے، میوزیم ۔ امریکہ کا اہم ادبی اور تہذیبی مرکز ہے ۔ مشہورِ زمانہ میوزیم کے سامنے طویل قطاریں اندر جانے کی منتظر تھیں ۔ پیرس سے تولوس لاترک کی نمائش آئی ہوئی تھی ۔ یہی فن پرست شہر ڈاکوؤں کا اڈہ بھی ہے ۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے مشہورِ عالم انسٹی ٹیوٹ آف اورنٹیل آرٹ کے اندر اشوریہ اور مصرِ قدیم کے ایوانوں میں استانیاں طلبا کی ٹولیوں کو لیکچر دیتی پھر رہی تھیں ۔ مصر کی ہر اچھی چیز کا رشتہ نادیا عہدِ فراعنہ سے جوڑتی ہے ۔ ہمارے ہاں بات بے بات اشوک یا شاہجہاں یا اورنگ زیب یا شواجی کا حوالہ دیا جاتا ہے ۔ اور اس سلسلے میں کافی نعم البدل ہے ۔ کوئی انگریز یا جرمن یا اطالوی اُچھل اُچھل کر شیکسپیئر اور گوئٹے اور مائیکل اینجلو کے گُن نہیں گاتا ۔ ہم کالیداس، ٹیگور، غالب کا وظیفہ کرتے کرتے بے حال ہوئے جاتے ہیں ۔ بھوکوں مر رہے ہیں، حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں مگر اپنی کلچر کا راگ الاپنے سے باز نہیں آتے ۔ ایک امریکن نے حال میں ایک خاصا جلا کٹا مضمون لکھا ۔ اس نے تیسری دنیا کو ZOO NATION کہا تھا جن کی خصوصیات "تاریخ" تہذیب

اور گھریلو صنعتیں" ہیں۔ اور جو اقتصادی طور پر اتنی پس ماندہ ہیں کہ مغرب کی سطح تک پہنچنے میں ان کو سو سال لگیں گے اور اس وقت تک مغرب مزید ایک سو سال آگے نکل چکا ہوگا۔

اور دنیا کی بلند ترین عمارت ایک سو چھ منزلہ سیرز ٹاور زمیں جٹ لفٹ نے ایک منٹ کے اندر آخری منزل تک پہنچایا جہاں سے جگمگاتا شکاگو ایک فنٹاسٹک اور منفرد نظارہ تھا۔ اور پلے بوائے کی بلند عمارت کے اوپر سرچ لائٹ گھوم رہی تھی۔ مبادا کوئی طیارہ عمارت سے ٹکرا نہ جائے۔ یوحنان نے اپنے مکاشفے میں شہر بابل کو بھی دیکھا تھا۔

چودھری محمد نعیم کہ پیارے اور منن کی طرح عرصہ دراز تک امریکہ میں مقیم رہنے کی وجہ سے صالح مغربی رویّے اختیار کر چکے تھے۔ اور فضولیات، خرافات، تضیعِ اوقات اور بے وقوفوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک شام جب تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوٹل ونڈ میر کے نزدیک ساؤتھ ہائیڈ پارک میں واقع اپنے وسیع اپارٹمنٹ کے کھانے کے کمرے کی میز پر رکابیاں سجاتے ہوئے انہوں نے مطلع کیا کہ "کار جہاں دراز ہے" کی قسم کا موضوع یہاں یونیورسٹی آف نیویارک کے ایک امریکن ماہر عمرانیات نے منتخب کیا ہے۔ وہ شمالی ہند کے مسلمان گھرانوں کے شجروں اور شادیوں کے نٹ ورک پر کام کر رہے ہیں۔

دِنی کے کائستھوں کے نٹ ورک کی ایک رکن یعنی میری دوستوں شانت اور اوم بہادر کی کزن کرونا بہادر عرصہ دس سال سے شکاگو میں بطور ماہرِ نفسیات ملازمت کر رہی تھی۔ میز پر اپنے مقابل میں بیٹھی نادیا لبشانی سے کہہ رہی تھی۔

"یہاں چرچ اور فیملی لائف کا بریک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ ماں باپ اور پادری کی جگہ اب ہندوستانی سوامی لے رہے ہیں۔ یہاں بھی اور سارے مغربی یورپ میں۔

اس کے برعکس یہاں بس جانے والے ہندوستانیوں پاکستانیوں کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ ان کی لڑکیاں جو یہیں پیدا ہوئیں یا پروان چڑھیں ان کو ہندوستانی یا پاکستانی اخلاقیات پر قائم رہنے کے لئے کس طرح مجبور کریں۔"

"یہ مسئلہ انگلستان کے براؤن مہاجرین کے سامنے بھی ہے" میں نے کہا۔

"PILL کی ایجاد کے ساتھ یہاں ایسی جنسی آزادی آئی ہے جو دس پندرہ سال قبل یہاں بھی موجود نہیں تھی۔ میرے امریکن دوست متعجب رہتے ہیں کہ میں DATING کیوں نہیں کرتی اور جب میں ان سے کہتی ہوں کہ یہ ہماری تہذیب اور طرزِ زندگی کے منافی ہے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ تمہارے پرانے کانسٹنٹ تہذیبی NET WORK کا اثر ہے۔ ورنہ DATING تو اب ہندوستان میں بھی رائج ہو چکی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں مگر میں پچھلی نسل سے تعلق رکھتی ہوں" کماری کرونا نے جواب دیا۔

آنسہ نادیا نے سر ہلایا "میں تمہاری صورتِ حال سمجھتی ہوں کیونکہ میں بھی مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک مصری قدامت پرست روایات و تمدن کی پروردہ ہوں۔"

باہر بارش کے ساتھ تیز ہوا چل رہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کرونا بہادر اٹھ کر گیلری میں گئی دروازہ کھولا۔ چند گورے امریکن بچے نقلی چہرے لگائے کھڑے تھے۔ چودھری نعیم نے ٹافیوں کے ڈھیر دروازے کے قریب پہلے سے رکھ دیئے تھے۔ کرونا نے بچوں کو ٹافیاں دیں اور وہ واپس آ گئے۔ وہ ہیلو این تھی۔ ALL SOULS DAY کی مقدس شام۔ ایک قسم کی مسیحی شب برات۔ جب تمام عیسائی مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ آدھے کدو پر بھتنوں کی شکلیں بنا کر کدو کی شکلیں بنائی جاتی ہیں اور ان شکلوں کے اندر شمع جلائی جاتی ہے اور وہ کدو دریچوں میں رکھ دیئے جاتے

ہیں بچے بھتنوں کے مصنوعی چہرے لگا کر گھر گھر جاتے ہیں اور مٹھائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

"شکر ہے کہ کچھ پرانی روایات تو ابھی یہاں بھی باقی ہیں۔" نادیا نے کہا۔

دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔ کرونا نے جا کر ٹالنی دی اور واپس آئی۔

"چاند اور زہرہ کی طرف جانے والے راکٹوں میں شمعیں جلا کر یہ آدھے کدو رکھ دیئے جائیں تو کیسا رہے۔" میں نے کہا۔

صبح سویرے نادیا قبطیہ آیو واسٹی واپس گئی اور چودھری نعیم اپنی ادھی مسلمان روح کے ساتھ اور راما بخن اپنی تامل روح کے ساتھ شکاگو میں رہتے ہیں۔ دونوں بزبان انگریزی اپنی نثر و نظم لکھتے ہیں۔ اور چودھری نعیم سے ایک آسٹریلین اُردو پڑھ رہا ہے۔

ایک شام ہم لوگ مع آسٹریلین میڈلن روانہ ہوئے۔ چودھری صاحب شکاگو پیچھے چھوڑ کر فری وے پر آئے۔ شہر کی عمارتیں جو رات کو منور سنگلاخ پہاڑ معلوم ہوتی تھیں پیچھے رہ گئیں۔

راستے میں ایک ریسٹوران میں میں نے اس بندۂ خدا سے جو اُردو پڑھنے آسٹریلیا سے شکاگو آیا تھا، دریافت کیا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے؟"

"میر انیس۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "سوال یہ ہے کہ اگر ہم لوگ شیکسپیئر سمجھ سکتے ہیں تو وہ آسٹریلین میر انیس کیوں نہیں سمجھ سکتا۔

گو شب برات اور ہیلو این میں بڑا فرق ہے۔

دُور کی بانسری کے سُر

اور شکاگو سے دو سو میل دُور شمالی ریاست وِس کون سن کے شہر میڈیسن میں ڈاکٹر محمد عمر میمن کے گھر پر رات کے وقت جب ہم لوگ پہنچے تو وہاں ڈیوک یونیورسٹی کے پروفیسر بروس لارنس کو برطانیہ کے مستشرق سائمن ڈگی کے ساتھ کشف المحجوب پر تبادلۂ خیالات کرتے پایا۔ معقول۔ پروفیسر لارنس نے خواجگان چشت پر کتاب بعنوان NOTES FROM A DISTANT FLUTE لکھی تھی جسے "زیر سرپرستی امپرس فرح پہلوی امپیریل ایرانین اکیڈیمی آف فلاسفی" جس کے ڈائریکٹر سید حسین نظر تھے) نے ۱۹۷۸ء میں طہران سے شائع کیا تھا۔ ایک سال بعد ۲ نومبر ۱۹۷۹ء کی اس رات وہ امپریس بحیثیت ایک جلاوطن بیوی اپنے بے تخت وتاج شوہر کے علاج کے لئے نیو یارک کے ایک ہسپتال میں مقیم تھیں۔ اور صرف دو دن بعد طہران میں امریکن یرغمالیوں کا دھماکہ ہونے والا تھا۔

تو کیا خواجگان چشت بے ثباتی ثروت وجاہ کے ان معاملات کو بہت پہلے پہچان چکے تھے۔

دوسری کتاب پروفیسر لارنس کی صوفیائے بیجاپور تھی۔ اور ان کے بیحد ذہین اور شگفتہ فراخ میزبان محمد عمر میمن کی ضخیم کتاب ابن تیمیہ پر ہالینڈ سے چھپ

کر آ گئی تھی۔ اور ابن تیمیہ صوفیا کے شدید مخالف تھے۔

بانسری کے مختلف سُر

یونیورسٹی آف وِس کون سِن میں ساؤتھ ایشین اسٹیڈیز کی آٹھویں سالانہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس کے لئے کئی سو مستشرق انڈولوجسٹ ماہر اسلامیات و عمرانیات ولسانیات وغیرہ وغیرہ سارے شمالی امریکہ اور برطانیہ سے آیا تھا اور آئی تھی۔ بوڑھے پھونس پروفیسر پرسیول اسپیرز اور مس میری تھیچر انگلستان سے تشریف لائی تھیں۔ مس تھیچر نے راج کے زمانے میں انگریز سویلین اور فوجی افسروں وغیرہ کی کھینچی ہوئی بہت پرانی ہوم مووِیز کو جوڑ کر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی تھی۔ راج کی برٹش کولونیل معاشرتی زندگی کی جھلکیاں جو خالص راقم الحروف کا موضوع تھا "برٹش فکشن میں انڈین اسٹریوٹائپ" اور انڈین فکشن میں برٹش اسٹریو ٹائپ"۔ اور انڈین فکشن میں برٹش اسٹریوٹائپ" کے سیمینار میں یونیورسٹی آف مسوری کی میری لاگو نے ای۔ ایم فورسٹر، کولمبیا کے ڈاکٹر ووبن لوئیس نے

LEARNING HOW TO RULE AN EMPIRE, STERE
_ORYPES IN VICTORIAN BOYS, UTERATURE ——

یہ مقالے پیش کئے اور ناچیز نے "آخر شب کے ہمسفر" میں سے" چارلس بارلو بنگال سویلین" والا باب تلخیص و ترجمہ کر کے پڑھا۔

اسلامی سوانح عمریوں اور ملفوظات کے سیمینار میں بروس لارنس نے فوائد الفواد سیر الاولیاء وغیرہ، یونیورسٹی آف ورجینیا کے پروفیسر رچرڈ بارنٹ نے نواب شجاع الدولہ کی اٹھارویں صدی کی سوانح عمریوں اور ڈیوک یونیورسٹی کے ڈاکٹر معظم صدیقی نے چہار عنصر اور دوسری کتابوں میں مرزا بیدل کی سوانح حیات پر مقالے

پڑھے۔ سامعین وشرکا ڈرالاوُنج میں صبح کو جمع ہوکر اَن گنت سیمناروں میں سے اپنی پسند کا موضوع چُن لیتے۔

تاریخ دہلی کے سیمینار میں نئی دہلی کی تعمیر پر جو صاحب بولے وہ ڈاکٹر سہاس چکرورتی نکلے۔ جن کی کتاب FROM OX US TO KHYBER پر مَیں نے دو سال قبل ٹائمز آف انڈیا میں ریویو آرٹیکل لکھا تھا۔ اوکسفرڈ کے پروفیسر سمین ڈگبی دلمبی داڑھی، خود بھی صوفی منش) خواجگان چشت کے تجرات خلقا، پر اپنا مقالہ لے کر ایک شام محمد عمر میمن کے گھر آئے۔ کارِ جہاں دراز جلد اول پیانو پر رکھی تھی، اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک فٹ نوٹ پر ٹھٹھک کر نوعمر ڈاکٹر رچرڈ بارنٹ نے مجھ سے کہا "کمال الدین حیدر رامپور کے نقطۂ نظر سے لکھا تھا" اور پھر صفحات پلٹنے لگا۔

ڈنر کے دوران میری بھتیجی کی ڈوکومنٹری فلم کا ذکر نکلا۔ وہ فلم خود میرے لئے بہت نوسٹلیجک تھی۔ کیمپ لائف سول لائنز کلب۔ سرکٹ ہاؤس۔ پہاڑ پر جانا ہاتھیوں پر سواری وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب میرے اپنے بچپن کے مناظر تھے۔ اور کیا پتہ یہ دھندلی ہوم مووِیز جوان "بڑے صاحب لوگوں" نے کھینچیں ان میں سے چند بچپن کی وہی مانوس ہستیاں رہی ہوں۔ میجر گیربڈ، مسٹر بیند رسول، مسٹر ڈی پی ہارڈی، میری بھتیجی، بتارہی تھیں کہ اس فلم کی تیاری کے لئے انہوں نے بہت پاپڑ بیلے۔ انڈین سول سروس والے بڈھے مرکھپ گئے۔ ان کے ورثا کو ڈھونڈا ان لوگوں نے اپنے مکانوں کی پر چھتیوں میں جمع کاٹھ کباڑ میں سے یہ دھندلی ہوم مووِیز نکال کر دیں"۔

مَیں نے کہا "شاید اسی وجہ سے آپ کا چارلس بار لو بنگال سویلین اس فلم کا ایک حصہ معلوم ہوا" کسی نے اظہارِ خیال کیا۔ آج کل انگلستان میں راج کا نوسٹلجیا زوروں میں جارہا ہے اور غدر کے متعلق اس زمانے میں لکھی ہوئی کتابوں کی بڑی مانگ ہے

پروفیسر سائمن ڈگبی زلفیں جھٹکار کر بولے" موصوف یقیناً کہیں سجادہ نشینی کر سکتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں ایک ادھ جلی کتاب تھی۔ مریم دی اسٹوری آف دی میوٹنی۔ جو شاید غدر کے دو تین سال بعد چھپی تھی۔ یہ کتاب میرے پر دادا میر احمد علی کے بچے کھچے ذخیرۂ کتب میں پڑی ملی تھی۔ ناول تھا۔ مریم۔ انگریز یا ہندوستانی ہیروئن کا نام رکھا ہوگا۔ نیلے رنگ کی جلد تھی۔ ناول کے آخر میں شاہ نعمت اللہ ولی کی طویل نظم کا انگریزی ترجمہ شامل تھا۔ اس میں لکھا تھا یوں مغل سلطنت قائم ہوگی وغیرہ اور یہ کہ فلاں زمانے میں پنجاب میں خون کا چھوٹا دریا بہے گا۔ ۴۷ء کے ہنگامے میں وہ آدھ جلی کتاب شاید پوری جل گئی۔ میں نے اس کا نام کسی کیٹیلاگ میں بھی نہیں دیکھا۔"

"سوتھبیز کے ہاں تلاش کیجئے گا۔" میں نے مولانا سائمن ڈگبی سے کہا۔

"اس قسم کی نظمیں الحاق ہوتی ہیں۔" محمد عمر میمن نے کہا۔ سکھوں کی جنم ساکھیوں کی طرح جس میں زار روس وغیرہ کے متعلق پیشگوئی موجود ہے۔"

"درست۔" میں نے جواب دیا۔

"۷۱ء میں بنارس سرکٹ ہاؤس کے مسلمان خانساماں نے مجھ سے کہا تھا بیٹیا آج کل یہاں مسلمان محلوں میں شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشن گوئی کا بڑا چرچا ہے۔ وہ بتا گئے تھے کہ مشرقی پاکستان میں یہ سب ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ کسی بھی کرائسس کے موقع پر عوام کے ہاں شاہ نعمت اللہ ولی اچانک کیوں نمودار ہو جاتے ہیں۔ بڑی ڈراؤنی بات ہے۔"

ٹیلی ویژن پر خبریں شروع ہوئیں۔ طہران کے امریکن سفارت خانے میں تریپن امریکنوں کو بطور یرغمال محبوس کر دیا گیا۔

ہر چینل پر تہلکہ مچا ہوا تھا۔ وہ ۴ نومبر کی رات تھی۔ "بڑی ڈراؤنی بات ہے۔"

میں نے دہرایا۔

"کاش وہ ادھ جلی نیلی کتاب پوری نہ جلتی۔

محمد عمر میمن کی خاموش طبع پرسکون جاپانی بیوی نے اپنے بچوں کو کھانے کے لئے بلایا۔

"کیا آپ واقعی ان سب ناقابلِ اعتبار ہوائی باتوں میں یقین رکھتی ہیں؟"

ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

"ایک طرف محمد عمر میمن کے عقلیت پرست ابنِ تیمیہ ہیں اور دوسری طرف افسانوی شاہ نعمت اللہ ولی اور ان کا سارا قبیلہ۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ شاہ نعمت اللہ ہی کو ترجیح دوں گی" میں نے جواب دیا۔

. . . . .

موسمِ سرما شروع ہو رہا تھا۔ آئیوا سٹی میں بھی درخت اپنے سرخ اور زرد اور عنابی پتے تیزی سے گرا رہے تھے۔ انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام کے لئے مشہور امریکن ادیبوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جوزف ہلر، اسنوڈ گراس، لوئیس سمپسن، ہورٹینس کیلی شر، کرٹس ہارنیک، کالا ناولسٹ، اسمٰعیل ریڈ، امریکہ یہودی اور کالے ادیب بہت زیادہ قابلِ ذکر چیزیں لکھ رہے تھے۔ کیلی شر اور جوزف ہلر دونوں یہودی تھے۔ ایک روسی ناولسٹ سوویت یونین سے آئے تھے۔ جن دنوں میں ورمونٹ گئی ہوئی تھی وہ مے فلاورز میں مع ترجمان ہفتہ بھر ٹھہرے۔ یونیورسٹی میں ان لوگوں کے لئے لیکچر ہوئے اور پروفیسروں کے ہاں دعوتیں اور ادبی محفلیں۔

آئیوا سٹی "ادیبوں کا چوراہا" کہلاتی ہے۔ مقامی ادبی محفلیں کیمپس پر عموماً جمز بک اسٹور اور ویٹ بار میں منعقد ہوئی تھیں جہاں لوگ باگ اپنے افسانے پڑھتے یا کلام سناتے اور اس پر بحثا بحثی ہوتی لیکن نہایت تہذیب کے ساتھ

گھٹیا ریمارک ذاتی حملے فقرے چھینٹے جلی کٹی گفتگو ان لوگوں کا شیوہ نہیں۔ کیونکہ ان کو وہ ذاتی فرسٹریشن نہیں جو تیسری دنیا کے محروم و مفلس ادیبوں کا مقدر بن چکے ہیں۔ مغربی ادیب ایک SUPER AEELUENT ٹیکنولوجیکل معاشرے کے پیدا کردہ مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ تیسری دنیا کا ایک لیکھک جب اس معاشرے میں شامل ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔؟

یاسمین مغل کے مڈل کلاس کوکنی مسلمان والدین رتنا گیری کے باشندے ہیں۔ وہ خود آج سے گیارہ بارہ سال قبل ایک اسکالرشپ حاصل کر کے بمبئی سے امریکہ گئی۔ وہاں ایک کا۔۔۔ سے شادی کر لی۔ شادی ناکام رہی۔ دوسری شادی ایک انڈین مسلم انجینئر سے کی جو کیلی فورنیا میں رہتا ہے۔ سال بھر سے وہ رائٹرز ورکشاپ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کرنے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں کی دعوتوں میں یاسمین ایک لونے انگریز شاعر کریس کے ساتھ اکثر آتی رہتی تھی۔ ایک شام پیٹر اور میری ناضرہ کے گھر پر اس نے مجھ سے کہا "میں تم کو اپنا ناول دکھانا چاہتی ہوں جو میں لکھ رہی ہوں، اور تمہاری رائے چاہتی ہوں۔"

"رائٹرز ورکشاپ میں تم لوگ کیا کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "لکھنا سکھایا نہیں جا سکتا یہ خداداد صلاحیت ہے۔ امریکن یونیورسٹیوں کے یہ رائٹنگ اور شاعری سکھانے کے ورکشاپ میری سمجھ میں آج تک نہ آئے۔"

"اس خداداد صلاحیت کو سنوارا بھی جا سکتا ہے۔ سُریلی آواز والے لوگ استادوں سے کیوں گانا سیکھتے ہیں؟" یاسمین نے پوچھا۔

"پرفورمنگ آرٹس اور تخلیقی لکھائی میں بہت فرق ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم لوگ اپنے افسانے ناولوں کے باب نظمیں لکھ کر ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں اور ہمارے پروفیسر لکھنا سکھاتے ہیں ـــــ ٹینیسی ولیمز شیلورز اور فلپ روتھ

سب اسی آئیووا رائٹرز ورکشاپ کے تربیت یافتہ ہیں اور ٹینیسی ولیمز کا ڈرامہ THE GLASS MENAGERIE یہاں کی کلاس میں مسترد کر دیا گیا تھا۔

میں ایک ناول لکھ رہی ہوں۔ ایک مڈل کلاس ہندوستانی مسلمان لڑکی کا مغرب سے ٹکراؤ۔ اس کے جذباتی اور روحانی کرائسس، آٹو بیاگرافیکل ناول ہے تم کم از کم اس کے چند حصے پڑھ کر مجھے مشورے دو۔ اگلے ہفتے میں ویٹ بار میں اس کے چند باب پڑھوں گی۔ کرس اپنی نظمیں سنائے گا۔ میں نے انٹرنیشنل رائٹرز پروگرام کے سارے ادیبوں کو مدعو کیا ہے۔"

یاسمین کی نصف حبشی چار سالہ بچی نفیسہ آیووا ریویو کے کالے اڈیٹر کی گود میں بیٹھی چہک رہی تھی۔ اس محل میں زیادہ تر لوگ گورے تھے۔ نادیا مصری، میں، پیٹرا اور میری ایشیائی لیکن نفیسہ بالکل جبلی طور پر اس کالے اڈیٹر کی گود میں جا بیٹھی۔ ڈسکو رقص شروع ہوا۔ وہ بے تکان ناچی۔ یہ بھی اس کے افریقی خون کا اثر تھا۔

پارٹی کے اختتام پر کرس نے اپنی وہیل چیئر کا رُخ دروازے کی طرف کیا۔ کرسٹفر ایک بونا انگریز شاعر رائٹرز ورکشاپ میں یاسمین کا ہم جماعت تھا۔ برکلے میں پڑھ چکا تھا۔ بلحاظ قد و قامت چار سال کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ پیٹھ پر بڑا سا کوبڑ۔ چلنے پھرنے سے قطعی معذور ننھے ننھے ہاتھ اور بیحد مختصر ٹانگیں لیکن حسین چہرہ، سنہری داڑھی اچھا خاصا جیزس کرائسٹ معلوم ہوتا تھا قطعی سیلف کونشس نہیں تھا۔ معذور اپاہج لوگوں کے لئے جو خاص بسیں چلتی تھیں اپنی وہیل چیئر سمیت کسی ایسی بس پر سوار ہو کر خود ہر پارٹی میں پہنچ جاتا تھا۔ قہقہے لگاتا تھا۔ بحثیں کرتا تھا۔ سارے یورپ اور امریکہ کی تنہا سیر کر چکا تھا۔

آئیووا سٹی کے اَن گنت ریسٹوراں طرح طرح سے سجے ہوئے تھے۔ ایک طعام خانہ بادبانی بحری جہاز کے نمونے کا تھا۔ ہم جنس لوگ اور شاعر ادیب ویٹ بار کی سرپرستی کرتے

تھے (بیحد آواں گارڈ قسم کے لوگ اکثر ہم جنس تھے۔) ایک کہر آلود شام ویٹ بار کا ایک
ال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب کرسٹفر نے اپنی نظمیں سنائیں۔ پھر بولا۔
یں نے فارسی غزل کے فارم میں چند غزلیں لکھی ہیں وہ بھی سنو۔" اور غزل کی تشریح کی۔

یاسمین مغل نے اپنے ناول کے چند ابواب جستہ جستہ پڑھے۔ وہ ایک
صلاحیت اور حساس رائٹر تھی جیسا کہ وہ مجھے بتا چکی تھی۔ وہ ناول شفاف حد تھی
دنوشت سوانح تھا۔ امریکہ آنے سے قبل ایک متوسط الحال مسلمان لڑکی کا طرزِ حیات۔
اپ بائیکلہ پولیس اسٹیشن کا انچارج۔ وہ خود برقعہ پوش ماں کے ساتھ حاجی علی
لی درگاہ پر جایا کرتی ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس ماحول کا تصور کیا
دجس سے وہ مغربی سامعین بالکل ناواقف تھے اور ان کے لئے وہ ایک
EXOTIC الیکٹرونک ماحول) اور پھر اس اواگارڈ طعام خانے کے ایک نیم تاریک
کمرے کے اسٹیج پر بیٹھی ہوئی بے حد خود اعتمادی اور بے باکی کے ساتھ اپنا ناول
سناتی اس نیم امریکن لڑکی پر نظر ڈالی جس نے امریکہ میں جنسی تجربات کا تذکرہ
بیحد صفائی سے قلمبند کیا تھا۔ اگر وہ ناول امریکہ میں چھپا ہندوستانی پس منظر
کی وجہ سے بالخصوص پسند کیا جائے گا (جنسی بے باکی اب کوئی قابل ذکر بات
نہیں رہی۔ پچھلے چند سال میں ہر ان کہا رویہ مقفل الماریوں سے نکال کر جھاڑا
پونچھا جا چکا ہے۔ وہ لوگ اب اپنی مکمل جنسی آزادی سے بھی اکتا چکے ہیں۔ مرد
اور عورت کا بغیر شادی کیے اکٹھے رہنا قبول کیا جا چکا ہے۔ کیمپس پر ہم لوگ دو تین
ایسے جوڑوں کے گھروں پر ڈنر کے لئے جا چکے تھے۔ اس نئے طرزِ زندگی کا اب
ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہندوستان میں یاسمین کا ناول بہت مقبول ہوگا)
چند روز بعد یاسمین نے رائٹرز ورکشاپ کے ڈائریکٹر کے ہاں اپنی سالگرہ کی دعوت
کی۔ موصوف کو ان کے شاگرد دیبی محض جیک کہہ کر پکار رہے تھے۔ مرغن ہندوستانی

کھانا پکایا۔ ڈنر کے بعد رائٹرز ورکشاپ کے لبنانی نژاد پروفیسر وانس بورژیلی (جو ایک معروف مصنّف تھے) وائلن بجایا کیے۔ دو پروفیشنل موسیقار رات کے گیارہ بجے اپنے گٹار سنبھالے آن پہنچے۔ ان میں سے بے حد موٹا لڑکا بالکل گلیکسو بے بی معلوم ہوتا تھا۔ جیک کے میوزک روم میں ڈسکو شروع ہوا۔ کرس اپنی وہیل چیئر فلور پر لے آیا۔ جوش و خروش سے گاتا رہا۔ اتنے منّے سے پھیپھڑوں سے اسکاٹی لاک کی طرح اس کی اتنی طاقت ور آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ ناچنا تو کجا کھڑے ہونے سے بھی معذور تھا۔ مگر نہایت جوش اور ولولے سے اپنی وہیل چیئر فلور پر گھما گھما کر گویا رقص میں شامل رہا۔
"مغربی انسان کی ہمّت اور جوانمردی کی روشن مثال" نادیا نے آہستہ سے اظہارِ خیال کیا۔ یاسمین اس کی وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ ناچتی رہی۔ وہ گلا پھاڑ کر گایا کیا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے ایک امریکن لڑکی نے پیانو کے پاس جا کر ایک دلدوز گیت اُداسی کے ساتھ گانا شروع کیا۔ کرس اچانک خاموش ہو گیا اور اداسی سے اس کا گیت سُننے لگا۔ گلیکسو بے بی گٹار بجاتا رہا۔ باہر باغ اور خیاباں خزاں کے زرد اور عنابی پتوں سے پٹ چکے تھے۔ دور دیر خوبصورت، دو منزلہ مکانوں میں روشنیاں بجھتی جا رہی تھیں۔ یاسمین کی بچی نفیسہ بجلی کی طرح ناچنے کے بعد تھک کر سو چکی تھی۔ دیوار کے سہارے بیٹھے پیٹر نانز نے ماؤتھ آرگن جیب میں ڈالا۔ وہ ماؤتھ آرگن کا ماہر تھا۔ پروفیسر وانس نے اپنا مینڈولین کیس میں بند کیا۔ لڑکی نے گیت ختم کیا۔ ایک لمحے، محض ایک لمحے کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ کرس نے اپنی متحرک کرسی دروازے کی جانب موڑی۔ باہر خیاباں کے زرد برقی چراغوں کی روشنی میں پت جھڑ کے کھڑکھڑاتے سرسراتے فرش رات کی بھٹکتی روحوں کے منتظر تھے۔ دوستوں کے جشن گرتے ہوئے پتے ہیں۔

⁂

اسرائیلی رائٹرز اسحٰق اوپاز اور ہالینڈ کی تھیا نے ایک روز انکشاف کیا کہ وہ دونوں

یک دن ایک مہینے اور ایک سن کی پیدائش ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں اسحٰق نے یوکرین
(سوویٹ روس) اور تھیا نے ہالینڈ میں ایک ہی روز جنم لیا تھا۔ ہم تو امن
بہن بھائی اپنی سالگرہ اکٹھی منائیں گے۔ تھیا نے اعلان کیا۔ تھیا اور برٹ
نے صرف تین سال قبل شادی کی تھی۔ برٹ ہالینڈ کا نامور مصنف بھی تھا۔
دونوں میاں بیوی بہت بھلے اور خوش طبع لوگ تھے۔ دعوت کی شام ان
کے اپارٹمنٹ میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ دونوں کمروں اور باورچی خانے
بں بھانت بھانت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ ہولیو سیزر۔ بولو "میں لیبوٹری کا رائٹر نہیں"
اسحٰق او پاز نے گرج کر جواب دیا "کرے کے دریا اور آگ کے دریا
ح یں جو درمیانی راستہ ہے۔ اس پر سے گذرو"
جوزف ہلر اچانک دروازے میں نمودار ہوئے CATCH 22 لکھ کر راتوں
بت وہ مائرن کی طرح عالمگیر شہرت کے مالک ہو گئے تھے۔ قد آور سر پر سلور
رے جھبوا بال۔ موٹے سیاہ فریم کی عینک، انٹلکچوئیل یہودی شکل انتہائی کامیاب
بیب کی روشن مثال۔
اس وقت مشرقی جرمنی کا کول ہاس پیٹر ناضرۃ سے کہہ رہا تھا "میں ایک
وشلسٹ ملک سے آیا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ انسانیت کی ترقی کیسی ہونی
ہیئے۔ مگر میں یہ نہیں کہتا کہ اچھا ادیب ہونے کے لئے لفٹ ہونا ضروری ہے۔
ں بائیں بازو کا بھی ہوں اور رائٹر بھی لکھتے ہوئے انسان خود بخود لفٹ ونگ
جاتا ہے۔ دنیا کے حالات ہی ایسے ہیں۔"
برازیل کے سینر نے جواب دیا "ہاں ہمارا دل بھی تو بائیں طرف دھڑکتا
ہے۔ اگر تم ایک اچھے ادیب ہو تو تم کو ضرور احساس ہوگا کہ دنیا میں کتنی گڑبڑ
اور حالات کو بدلنا چاہیئے۔ ادیب اصلی مورّخ ہے۔ حکومتیں تاریخ نہیں

بناتیں وہ تاریخ کو منجمد کر دیتی ہیں۔" اسحٰق او پاز نے جواب دیا۔
جمیل حسین فلسطینی اس پارٹی میں مدعو نہیں تھا ورنہ وہ اسحٰق کی بات کا جواب دیتا
اسحٰق دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اطالوی یہودی ادیب آلڈو روزینی اور
انگریز یہودی رچرڈ (جو یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھاتا تھا۔) نے اسحٰق کو گھیر
لیا "ایک بات بتاؤ اسحٰق۔ تم اسرائیلی اتنی بلندی سے بات کیوں کرتے ہو۔ میں ابھی
ابھی یونیورسٹی میں تمہارے توپ ادیب ابراہیم یوشوع کا لیکچر سن کر آرہا ہوں ـــ
اس قدر بددماغی۔" اطالیہ کے یہودی آلڈو دونوں سیکولر اعتدال پسند موسوی پنجے
جھاڑ کر اسحٰق کے پیچھے پڑ گئے۔ اسحٰق خاصا گھبرایا ہوا چپکا بیٹھا رہا۔ پولینڈ کا طویل
القامت مائیکل پاس سے گذرا۔ ٹھٹھک کر بحث سننے لگا۔ وہ ایک کمیونسٹ
ملک اور یوروپ کے عیسائی ورثے کا نمائندہ یوروپ کے ان تین یہودی دانشوروں
کو صیہونیت کے نظریات کے متعلق جھگڑتا سن کر خاموش رہا۔ آگے بڑھ گیا۔ اب
یوگوسلاویہ کا ہنس مکھ میتوزی جو دانوسکی قریب آیا۔ وہ بھی بحث میں شامل نہیں
ہوا۔ کونے میں فرش پر بیٹھے پیٹر ناضرت نے ماؤتھ آرگن بجانا شروع کر دیا۔ پھر میری
ناضرت اچانک ایک سواحلی گانا گانے لگی :
"ملائکہ ملائکہ"
"وژن ـــ وژن اصل چیز ہے۔" اسحٰق نے ذرا جوش سے دہرایا۔
جرلیس سیتر مارٹن آکر فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اب تک اسحٰق
سے صیہونیت کے متعلق جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "ہر رائٹر کے اندر کہیں نہ کہیں ایک
یوٹوپیا چھپا ہوتا ہے۔ مستقبل کے متعلق۔"
"اور وہ رائٹر جو ماضی کی طرف دیکھتے ہیں؟" میتوزی نے دریافت کیا۔
"مستقبل ماضی کا خیال دلاتا ہے اور ماضی مستقبل کا۔ ماضی کا حوالہ دیئے بغیر محض

حال کے متعلق لکھ کر تم وجودی ادیب نہیں بن سکتے ۔" اسحٰق نے جواب دیا۔

تھیا نے ریکارڈ پلیر پر میوزک چلا دی ۔ رقص شروع ہوگیا۔ کچن میں جمع لوگ گا رہے تھے ۔ برٹ قہقہے لگا رہا تھا۔ اسحٰق نے کچن میں واپس جا کر اسرائیل کا ایک مقبول عبرانی گیت چھیڑا۔ سب کورس میں شامل ہو گئے (غالباً برٹ اور تھیا بھی یہودی تھے) گیت میں حیا۔ حیا۔ برابر دہرایا جا رہا تھا۔ یعنی زندگی ۔ زندگی ۔ زندگی ۔ دوسرے بیڈ روم کی دیوار پر نصب فون کی گھنٹی بجی ۔ برٹ اس طرف لپکا۔ کچن میں گانا جاری رہا ۔ سارا اپارٹمنٹ موسیقی اور "حیا ۔ حیا۔ کی تکرار سے گونج رہا تھا ۔ اچانک لیلیٰ اریل باورچی خانے میں آئی اور اس نے آہستہ سے کہا" تھیا ایمسٹرڈیم سے فون آیا ہے۔ برٹ کے والد کا انتقال ہو گیا۔"

سناٹا ۔ برٹ فون پر مصروف تھا۔ لیلیٰ بولی "برٹ کی بہن ایمسٹرڈیم سے بات کر رہی ہے ۔"

تھیا نے متفکر ہو کر مجھ سے کہا "یہاں کے شور اور گانے بجانے کی آواز میری نند کے کانوں میں پہنچ گئی ہوگی ۔ وہ کیا سوچے گی۔ میرے سسر وہاں اتنے بیمار پڑے تھے اور میں یہاں رنگ رلیاں منا رہی ہوں ۔"

نند بھاوج کا مسئلہ عالمی ہے ۔

برٹ بات ختم کر کے کچن میں آیا۔ سب خاموش ہو گئے ۔ برٹ میز پر ٹک گیا۔ چند لمحوں بعد بولا" والد نوے سال کے تھے ۔ بھرپور زندگی گذاری ۔ وہ استاد تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد سارے ہالینڈ میں موجود ہیں ۔ انہوں نے ساری عمر اپنا علم دوسروں تک پہنچایا۔ میری بہن کہہ رہی تھی کہ وہ آخر وقت تک ہوش و حواس میں تھے۔ میرے یہاں آنے سے ذرا پہلے بیمار پڑے تھے ۔ مجھ سے کہا تم ضرور امریکہ جاؤ۔ اپنے علم اور تجربے میں اضافہ کرنے کا کوئی موقعہ کبھی نہ کھوؤ۔ میری وجہ سے مت رکو۔ میرا کیا ہے میں تو اپنی زندگی

گزار چکا۔ کل صبح میں ان کی تجہیز و تکفین کے لئے ہالینڈ جاؤں گا۔ ہفتہ بھر کے
کل شام جیمز یک اسٹور میں مجھے اپنا افسانہ پڑھنا تھا وہ میرے بجائے تھیا پڑھ
دے گی۔ THE SHOW MUST GOON۔"

"اب ہم لوگ چلتے ہیں برٹ۔" اسحٰق نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ پارٹی جاری رکھو۔ میں ذرا لیٹ جاؤں۔" وہ کچن سے ملحق بیڈ
میں جا کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ تھیا نے درمیانی دروازہ بند کرنا چاہا۔ برٹ نے
کہا "نہیں۔ دروازہ کھلا رکھو۔ میں تم سب کو تفریح کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پارٹی رات کے دو بجے تک جاری رہی۔

سوپ اوپیرا

جیمز بک اسٹور میں حسبِ معمول سب لوگ فرش پر بیٹھے کوک، سون اپ
ببیئر سے شغل کر رہے تھے۔ تھیا برٹ کا افسانہ پڑھ رہی تھی۔ انڈونیزیا کے شو یند و
فرانز باچھیں کھلائے ہمہ تن گوش تھے۔ ان دونوں کا برٹ اور تھیا سے سابق
اور موجودہ آزاد قوم والا وہی نوسٹلجک دوستانہ رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ جو ایک
ب قومی کیمسٹری کے ذریعے انگریزوں اور ہندوستانیوں پاکستانیوں کے
یان استوار ہے۔ یونان کے آری نے اپنی تازہ نظمیں سنائیں۔

ایک بار آری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا باپ ایک غریب موچی تھا۔ وہ اب بھی
، ہاتھ سے جوتے بناتا ہے۔ افلاس کی وجہ سے میں بارہ سال کی عمر تک اسکول
ب جا سکا۔" امریکہ کے بارے میں اس کے ری ایکشن ہمیشہ بہت دلچسپ
تے تھے۔ برٹ کے ہالینڈ سے واپس آنے کے بعد ایک روشن اتوار کو ہم لوگ
دُور دریا کنارے پکنک کے لئے گئے۔ پویلین اور باربیکیو چولہے وہاں پہلے
موجود تھے اور جنگل بیابان میں جا بجا نفیس و نرم پلاسٹک کے استر والے کوڑے
بند ڈھول۔ پویلین کی صفائی دیکھ کر آری نے مجھ سے کہا۔" یہ امریکن یقیناً صبح د
ا اسے بھی ویکیوم کلین کرتے ہوں گے۔"

آرسی یونان کے نیشنل ریڈیو میں کام کرتا تھا۔اس کے علاوہ کافی لوگوں کا
تعلق ذرائع ابلاغ سے تھا۔ ناولسٹ اشوینیدوجکارتہ کے سب سے بڑے اخبار
سے منسلک تھا۔شوانگ پیکنگ فارن لینگویج پریس کے شعبہ انگریزی تراجم کے
نگران اور چینی مصنفین کے ایسوسی ایشن کے غیر ملکی تعلقات کی کمیٹی کے چیف تھے۔
(گویا پیکنگ میں ان کی وہی حیثیت تھی جو ماسکو میں مریم سلگانک کی ہے) آئرلینڈ کا
ڈرامہ نگار آئرن کیون کیسی آئرش ٹائمز کے لئے لکھتا تھا۔اسپین کا ناولسٹ ساچیز
ایسیر لیبیو ٹیلی ویژن اور فلم ڈائریکٹر تھا۔ ہینگرین شاعر مائیکلوس ہرازتی (جس
کی ایک کتاب کا دیباچہ ہنرخ بول نے تحریر کیا تھا) اخباروں کے لئے بھی لکھتا تھا۔
مشرقی جرمنی کا افسانہ نگار وولف گانگ کول ہاس فلم اسکرپٹ رائٹر بھی تھا۔فلپائز
کا ہوزے لکایا ماہنامہ "دی ریویو" کا ایڈیٹر تھا۔برازیل کا جولیسس سیزر مارٹن
شاعر اور ناولسٹ برازیلین ٹیلی ویژن کے ڈرامے لکھتا تھا۔اسرائیلی ناولسٹ
اسحٰق اور پاز جرنلسٹ تھا۔پولینڈ کے جرزی پر زیدکی کا تعلق اسٹیج اور یونیسکو
سے تھا۔مائیکل رونی کر پولش اسٹیج اور فلم ڈائریکٹر تھا اور اطالوی ناولسٹ
آلدو وزیلی روم کے سب سے اہم ادبی رسالے۔THE LIVING CHINA
کا ایڈیٹر تھا۔برٹ کا تعلق ہالینڈ میں تھیٹر سے تھا۔سُرخ چین کے شاذ شن وہار
کے لئے بے حد اہم صحافی تھے۔بحیثیت اخباری نمائندے دوسری جنگِ عظیم کے
دوران لندن میں رہ چکے تھے اور ایڈگر اسنو کے ساتھ مل کر انہوں نے ___
THE LIVING HINA لکھی تھی۔جب ساری دنیا کے اتنے سارے ادیب
جرنلسٹ اکٹھے ہوں تو ان سے مل کر کسی بھی اخبار والے کو بہترین کاپی حاصل ہو سکتی
ہے۔اس روز آیووا سٹی کے ایک اخبار کے دو نمائندے اس جنگل میں آن
پہنچے۔کافی خوشگوار چھائیں چھائیں ہوئی۔جولیو سیزر مارٹن حسبِ معمول دھاڑا ہے

جرنلسٹ اور رائٹر دونوں روزمرہ کے حقیقت سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق مصالحت کا ہے۔ ایک جرنلسٹ اور ایک رائٹر دونوں مثلاً جنگ کے متعلق لکھتے ہیں۔ رائٹر ایک قسم کا سوشل فلٹر ہوتا ہے۔ کل کے اخبار کے لئے لکھنے میں اور تاریخ کو مخاطب کر کے لکھنے میں بہت فرق ہے۔"

اسحٰق او پاز بولا "جرنلسٹ کے لئے بھی اخلاقی کمٹ منٹ ہوتا ہے۔"

کول ہاس نے کہا "ساری ادبی تخلیق تجربے اور تخیل پر منحصر ہے۔" ادب بذاتِ خود حقیقت نہ ہو مگر حقیقت رکھتا ہے۔"

پیٹر اور باقی لوگ ندی کنارے جا کر پلاسٹک کا ایک گول چکر ایک دوسرے کی طرف پھینکنے کے مقبول کھیل میں مصروف ہو گئے۔ (سائنس کی طرح میں اسپورٹس کے معاملے میں بھی بلینک ہوں) آرسی یونانی تھا اور یونانی بہت عمدہ باورچی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بہترین مرغیاں بار بیکو کیں۔

شام کو جب ہم لوگ آبروداسٹی واپس جانے کے لئے گاڑیوں میں بیٹھنے لگے۔ اولگا حسبِ معمول دیر لگا رہی تھی۔

روڈلفو جسے میں ہالی وڈ فلموں کا ساؤتھ امریکن فلموں کا ویلن کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ شروع میں ایک خاتون کے ساتھ وارد ہوا تھا۔ جسے وہ اپنی بیوی کہتا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ خاتون غائب ہو گئی اور اس کے چند روز بعد اس کی بے حد حسین اور باوقار بیوی جو انگریزی کا ایک لفظ نہ جانتی تھی ارجنٹینا سے آن پہنچی۔ روڈلفو اسی طرح شرارت سے کندھے اچکا کر مسکراتا رہا۔ اس وقت وہ نہایت خلوص اور سنجیدگی سے بیوی کو فرکوٹ پہنا کر گاڑیوں کی طرف لا رہا تھا۔ سورج ندی میں ڈوبنے والا تھا اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

"ہم لوگ روانہ کیوں نہیں ہوتے؟" میں نے پوچھا۔

اچانک کیا دیکھا کہ پولیلین کے سامنے بہت سارے ساتھی سر جھکائے گھاس پر گھٹنوں کے بل چلنے میں مصروف ہیں۔

آری ہنستا ہوا بھاگا آیا" اولگا کا بندہ گھاس میں گم ہو گیا"

"خدایا۔ بوندا سا بندہ اندھیرا پڑے اتنی گھاس میں کیا ملے گا۔ بھوسے کے ڈھیر میں سوئی" نادیا بولی۔

لیکن بی بی اولگا میٹی نے مشرق و مغرب کے تیئیس ملکوں کے ادبا و شعرا کرام و ناقدین کو گھاس میں اپنا بندہ ڈھونڈنے کی مہم پر لگا دیا تھا۔ وہ سب مارے اخلاق کے اس ناممکن تلاش میں جٹے ہوئے تھے۔ بے چارے بزرگ ہیلنگرین نقاد یا لازنیگل چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے بندہ ڈھونڈتے بہت قابلِ رحم معلوم ہوئے۔

"مل گیا" اولگا دفعتہً چلائی۔ اولگا اور الفریڈو کی مادری زبان کولمبیا کی ہسپانوی تھی مگر صاف انگریزی بولتے تھے۔ الفریڈو ر کھچڑی داڑھی، خوبصورت اور مرنجاں مرنج، سوشیولوجی میں ڈاکٹریٹ لے چکا تھا اور اپنے جنوبی امریکن ملک کولمبیا کا مشہور شاعر تھا۔

بندہ وولف گانگ کول ہاس نے اپنی جرمن تیز نگاہی سے ڈھونڈ نکالا تھا

"کمال ہے" نادیا نے سر ہلا کر کہا۔

"اولگا ناقابلِ یقین ہے" فرانز بولا۔

"عموماً عورتیں ناقابلِ یقین ہوتی ہیں" آری نے جواب دیا۔

"یہ میل شوونزم کا رویہ ہے" امریکن جرنلسٹ لڑکی نے کہا۔

"مادام۔ میں پرانی دنیا کا ایک کٹر میل شوونسٹ ہوں" آری نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر بڑے اخلاق سے جھکتے ہوئے جواب دیا۔

"ترکوں اور یونانیوں کے رویّوں میں زیادہ فرق نہیں۔" میں نے کہا۔
"ہو نہیں سکتا۔ جغرافیہ اور تاریخ کا تقاضہ یہی ہے۔" آری لیلے سے مخاطب ہوا۔" اس پہ یاد آیا۔ لیلے تم دعوت کب کر رہی ہو؟ گولاش اور پلاؤ۔"

....

ایرکنڈیشنڈ سُوپر مارکیٹوں میں اشیائے خورد و نوش کا بے تحاشا تنوع اور ارزانی اور ارزانی مشرقی یورپ والوں کے لئے تحیر خیز تھی۔ ایک شام ہفتہ وار بیداری کے بعد میں ہنگری کی انگنس اور ان کے شوہر بالا زینگل کے ساتھ سُوپر مارکیٹ کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھی باقی لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ جو اپنی اپنی ٹرالیاں بے تحاشا سامان سے لاد کر کاروں کی طرف لا رہے تھے۔ اس وقت شیشے کی دیوار کے پیچھے چُنے ہوئے کیٹ اینڈ ڈوگز فوڈ" کے عظیم الجثہ بنڈلوں پر میری نظر پڑی۔ "آدھی سے زیادہ دنیا کے انسانوں کو پیٹ بھر کھانا میسر نہیں یہاں پالتو جانوروں کے لئے نعمتوں کے انبار۔" میں نے کہا۔
"ہمارے ہاں ہنگری میں تو میز پر جو ہڈی بچتی ہے وہی اپنے کتوں بلیوں کے آگے ڈال دیتے ہیں۔" بالا زینگل نے ملائمت سے کہا۔
"جو شرفاء کا قاعدہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

....

ٹیلی ویژن پہ اپنے فوڈ کے اشتہارات میں کتے بلیاں اداکاری بھی کرتے تھے۔ کولمبیا نیشنل اور امریکن براڈکاسٹنگ کے ہر NET WORK کے تحت چھ سو اسٹیشن مل ملا کر دو ہزار اور مقامی اور سٹلائٹ اسٹیشن ان کے علاوہ رات گئے تک اور صبح منہ اندھیرے سے مختلف لہروں پہ کلیسائی پروگرام بعض مرتبہ اس انداز کے گویا بزنس کنسرٹ بھی ایک ایڈورٹائزنگ CAMPAING ہیں۔ امریکن مذہبی آزادی کے

مظاہر یہ بھانت بھانت کے بے شمار خرچ ساٹھ کروڑ ڈالر سالانہ کر کے اپنے پروگرام نشر کرتے ہیں۔ ان کے واعظ پچھلی صدی کے BIBLE-THUMPING دورہ کرنے والے پادری کے عصری اوتار ہیں جو میڈلسن الونیو نیو یارک کے ایڈورٹائزنگ اور پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ جیسی مہارت بھی رکھتے ہیں۔ یہ واعظ باقاعدہ پادری کے بجائے LAYMEN ہیں ان میں سے ایک مقبول واعظ کو نوے لاکھ ڈالر سالانہ مع PERKS تنخواہ ملتی ہے (ہندوستان سے جانے والے ہندو سوامی اور یوگی بھی اپنا اپنا پرچار انتہائی مہنگے ماہرین تعلقات عامہ کے ذریعے کر رہے ہیں۔ ان کے آشرموں کا بجٹ لاکھوں ڈالر سالانہ کا ہے۔ یہ سارا پیسہ ان کو ان کے دولت مند امریکن چیلے دیتے ہیں) سارا ٹیلی ویژن تجارتی ہے اور اشتہاروں کے درمیان سوپ اوپیرا۔ (سنسنی منٹل رومینٹنگ سیریل جو گھریلو عورتوں میں مقبول ہیں) کامیڈی، مباحثے "ٹاک شو" رقص و موسیقی، پرانے اور نئے فلم، ڈرامے، تعلیمی اور بچوں کے پروگراموں کے تنوع کا کوئی حد وحساب نہیں۔ غیر تجارتی پبلک براڈکاسٹنگ سروس (پی بی ایس) کے انتہائی اعلیٰ درجے کے عالمانہ اور انٹلکچویل پروگرام، ڈرامے، فلم، مباحثے، انٹرویو، ہر امریکن نیٹ ورک، صبح سے لے کر آدھی رات تک متعدد بار اور بے حد ڈرامائی طریقے سے اپنے خبرنامے پبلش کرتا ہے۔ مذہبی اور دوسری مفید سروسوں میں بہروں کے لئے بیک وقت متوازی پروگرام ٹیلی کاسٹ کئے جاتے ہیں۔ ساری دنیا میں بکھرے نمائندے (مرد اور عورتیں) سٹلائٹ کے ذریعے روم، پیرس لندن ماسکو وغیرہ سے اپنی خبریں سناتے ہیں۔ امریکہ میں موجود خبریں پڑھنے والے خواتین و حضرات بلحاظ ملک مقبولیت "ٹاک شوز" کی ہر دلعزیز شخصیتوں جونی کارسن، یا ڈک ایویٹ وغیرہ کی طرح اہم ہیں۔ اکثر اہم اور فوری پروگراموں میں انٹرویو کرنے والے لاس اینجلز میں بیٹھے

ہوتے ہیں۔ اور واشنگٹن اور نیو یارک میں موجود شخصیتوں سے بالمشافہ گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

...

اسلام کو حسبِ معمول پہلے عرب اسرائیلی مسئلے کی وجہ سے اور اب ایرانی کرائسس کی وجہ سے انتہائی منفی پبلسٹی مل رہی ہے۔ مشرق کا اسٹریوٹائپ ہمیشہ سے منفی رہا ہے۔ کوئک اسٹرپس میں بھی ویلن عموماً ایک خشمناک عرب یا ترچھی آنکھوں والا اورینٹیل ہوتا ہے (اہلِ مشرق کے لئے سفید فام مغرب کا یہ تعصب صدیوں پرانا ہے۔ اور ان کے لاشعور میں رچ بس چکا ہے) آج بھی پگڑی باندھے سیاہ فام "ہندو" یا "چینی" اس امریکن فوک۔ اور کا ویلن ہے یا ایک "پُراسرار" ذیلی کردار۔ رڈیارڈ کپلنگ کے LESSER BREEDS WITHOUT THE کی مصنوعی اولاد۔ ایرانی کرائسس کے متعلق ذرائع ابلاغ نے جنگ پسندی ہسٹیریا کو جنم دیا ہے۔ اسلام اور LAW اینڈ الیسٹ گویا خون آشام ہلاکت پسماندگی اور جنون کا دوسرا نام ہے۔ ہندوستان کا تذکرہ بھی محض کوڑھیوں، بھکاریوں، اور افلاس کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ ایک مزاحیہ خبرنامے میں لڑکی نے پڑھا۔ کلکتہ "میں ایک عورت نے پانچ بچوں کو جنم دیا۔ ماں اور بچے خوش اسلوبی سے بھوکے مر رہے ہیں۔" امریکنوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا طرزِ زندگی ساری دنیا کو متاثر کر چکا ہے۔ سوویٹ یونین میں پوپ میوزک (خواہ وہ اس کا سوویٹ یونین ورژن ہی سہی) اور جینز مقبول ہو چکی ہے۔ سارا یورپ، اور ساری "تیسری دنیا" امریکن رنگ میں رنگی جا رہی ہے۔

قدیم یونان اور روما نے یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ امپیریل گپتا عہد نے مشرقی ایشیا اور میڈیول عربوں نے آدھی دنیا، امپیریل مغلوں نے ہندوستان، ایران نے نصف ایشیا اور امپیریل برطانیہ نے ہندوستان اور آدھی سے زیادہ دنیا

کو اپنے اپنے تمدن سے متاثر کیا تھا۔ ١٩٤٥ء کے بعد سے امریکہ کا بول بالا ہے۔
لیکن مشرق کے متعلق مارکوپولو اور ان کے بعد سولھویں صدی سترہویں
میں دوسرے یوروپین سیاحوں نے واپس جاکر جوانٹ سنٹ باتیں اپنے
لوگوں کو بتلائی تھیں۔ ایک عام مغربی آج بھی ہمارے متعلق تقریباً اتنا ہی جانتا
ہے۔ ترقی یافتہ طاقتور مغربی اقوام کا سنڈروم۔ تیسری دنیا والے ہم سے سیکھنا
اور حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو ہماری ضرورت ہے ہمیں ان کی نہیں (یہاں
دانش گاہوں یا مستشرقین یا اہل علم و فضل کا نہیں ایک عام قومی رویّے کا
ذکر ہے۔) لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے آج بھی مارکوپولو
اور برنیر کے عہد سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ آج راجستھان میں ایک عورت ستی
بھی ہوتی ہے اور عوام اسے دیوی بناکر پوجتے بھی ہیں۔ مسلمان عورتیں آج بھی
چلتے پھرتے سیاہ خیمے ہیں۔ ہندو لڑکیاں زیادہ جہیز نہ لانے کے جرم میں دھڑا
دھڑ زندہ جلائی جارہی ہیں۔ اچھوتوں کا مسئلہ پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک صورت
اختیار کرچکا ہے اور ایران میں عورتیں بھی "اسلامی انصاف" کے نام پر گولی سے
اُڑائی جارہی ہیں۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ دو بالکل مختلف قسم کے معاشرے
ہمیشہ ایک دوسرے کو عجیب اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں۔ انگریز حاکموں کا رہن
سہن۔ ان کی عورتوں کی آزادی اور مرد اور عورتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رقص
کرنا ہمارے اجداد کو شیطانی افعال معلوم ہوئے تھے۔ اسی طرح ہماری روایات،
پردہ وغیرہ اہلِ مغرب کی سمجھ میں نہیں آتا۔ (مغرب تو دُور کی بات ہے خود ایک ملک
میں رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے معاشروں کے متعلق لاتعداد
غلط فہمیوں اور تعصبات میں مبتلا ہیں) اور اب ایران نے اسلام کو جس رنگ
میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کے ردعمل پر متعجب نہ ہونا چاہیئے۔

ہماری نفسیات یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مسائل یا روایات کا معروضی تجزیہ کرنے کے بجائے نہایت جذباتی ہو کر معذرت آمیز دفاع میں مشغول ہو جاتے ہیں (مثال کے طور پر ہم مغرب کی برائی بھی کرتے جاتے ہیں لیکن ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے بچے بڑھیا انگریزی مدرسوں یا کانونٹ اسکول میں داخل ہو جائیں۔ اور اپنے قومی کردار کے اس تضاد پر ہم کبھی غور نہیں کرتے۔!)

امریکن اپنے قومی مسائل پر بلاکم وکاست بحث کرتا ہے۔ ٹی وی پر اور اخباروں میں سی آئی اے کی ریشہ دوانیاں، سیاسی معاملات۔ معاشرے کی تمام خرابیاں۔ جرائم۔ تشدد۔ نسلی منافرت۔ منشیات کا استعمال۔ بن بیاہی نوعمر ماؤں کی تعداد میں اضافہ۔ حقوقِ نسواں۔ بوڑھوں کی تنہائی لیکن ان مسائل کو حل کرنے کے لئے منظم اور موثر طریقے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی طرح محض منسٹروں کے بیانات اور پند و نصائح اور زبانی جمع خرچ نہیں۔ بوڑھوں کی تنہائی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ان کے پورے کے پورے شہر آباد کر دیئے گئے ہیں جن کا سارا انتظام وہ خود کرتے ہیں۔ اپنے ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن اور سمفنی آرکسٹر اور کمیونٹی سنٹر چلاتے ہیں۔)

سیاسی مذاکروں میں اب فلسطینی مجاہدوں کا نقطۂ نظر بھی تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جو چند سال قبل ممکن نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکن ذرائع ابلاغ پر یہودی غالب ہیں۔ ماہرین علوم و فنون، موسیقار، سائنس دان، یونیورسٹی پروفیسر، مصنفین۔ فنکار، اہم نظریہ ساز، سیاست دان، بڑے سرمایہ دار "شو بزنس" والے اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں قومِ یہود سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی زندگی میں ان کی شدید اہمیت اور افادیت اور ان کے متواتر اور موثر پروپیگنڈے کی وجہ سے بھاری امریکن اکثریت اسرائیل نواز ہے۔ میں نے ابھی

اینٹی اسلام ٹیلی ویژن خبرناموں وغیرہ کا ذکر کیا تھا لیکن ایک اہم نکتہ نظر انداز نہ کیجئے۔ اشکنازی یہودی مغرب سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مغربی تہذیب JUDAEO-CHRISTIAN یہودی مسیحی تہذیب ہے۔ انجیل مقدس کا عہد نامۂ قدیم مسیحی اجتماعی لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے۔ خود حضرت عیسےٰؑ یہودی تھے۔ مسیحی یوروپ نے صدیوں تک یوروپین یہودیوں کو اس وجہ سے پرسیکیوٹ کیا، کہ ان کے فلسطینی اجداد نے یسوع مسیحؑ کو مصلوب کروایا تھا۔ مگر وہی یوروپین یہودی مغربی تہذیب کے معماروں میں شامل ہیں۔ اسپینوزا، ہیڈیگر، ہائینے، مینڈل سون، ہنری برگساں، کارل مارکس، فرائیڈ، آئین اسٹائین اس طویل فہرست کے چند نام ہیں۔ ان کے مقابلے میں قرون وسطیٰ کے بعد کے کسی عالمی سطح کے عرب دانشور کا نام پیش کیجئے۔ جب نشاۃ ثانیہ کی یوروپین اقوام کا سابقہ انحطاط پذیر عربوں سے پڑا۔ وہ اپنے ابن رشد ابن خلدون وغیرہ کو بھی بھول چکے تھے۔ آج اگر آپ اہلِ مغرب، اور خود ہندوستان کے غیر مسلموں کو بتلائیے کہ میڈیول عربوں نے تاریک یوروپ کو روشن کیا تھا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ آج کے عرب تو وہ شیوخ ہیں جن کی عیاشی اور احمقانہ فضول خرچی ضرب المثل بن چکی ہے۔ حال میں لندن اسٹیج پر ایک واقعہ لطیفہ پیش کیا گیا کہ ایک عرب نے سارا شہر لندن خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ لہٰذا۔ اپنے مانوس سفید فام مغربی یہودیوں کے مقابلے میں ایک اجنبی مذہب اسلام (جو صلیبی جنگوں کے زمانے ہی سے بدترین مغربی تعصب کا شکار رہا ہے) اور ایک "پسماندہ" اجنبی مشرقی قوم عرب یا ایرانی یہاں تک پبلک کے ردِ عمل کا تعلق ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ خود اپنے امریکی یہودی دانشوروں کے کارناموں کے مقابلے میں امریکن عوام جب ان "شیوخ" کے "کارنامے" دیکھیں گے جو ہالی وڈ میں ایسے محل تعمیر کرتے ہیں جن کی چھتوں پر برہنہ عورتوں کی طلائی مورتیاں سجی ہوں یا جن کی وجہ سے طوائفوں نے

اپنے نرخ میں اضافہ کر دیا ہے۔ تو امریکن خواص و عوام کے ذہنوں میں کس قسم کا "عرب امیج" بنے گا؟ علاوہ ازیں مسیحی مغرب خصوصاً ہٹلر نے یہودیوں پر جو ظلم کئے، اس کے لئے مسیحی یورپ اور امریکہ اجتماعی احساسِ جرم میں بھی مبتلا ہے اور فلسطینی حقوق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اسرائیل کی حمایت کرتا ہے جن دنوں ٹیلی ویژن پہ یکے بعد دیگرے فلسطینیوں کے حقوق کے متعلق ان کے حامی کالے لیڈروں اور یہودی لیڈروں کے مابین مباحثے پیش کئے گئے۔ اس کے چند روز بعد ہی نازی جرمنی کے گیس چیمبرز میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کی ہلاکت کے متعلق ایک رونگٹے کھڑے کرنے والی انتہائی مؤثر فلم۔THE HOLOCAUST دکھلا دی گئی۔ چنانچہ فلسطینیوں کے موقف کا تھوڑا بہت جو اثر ہوا ہو گا وہ اس سے زائل ہو گیا۔ یعنی یہ کہ یورپین یہودیوں پہ اتنی بڑی قیامت گزر گئی۔ ان کے پسماندگان کے ملک اسرائیل کی ہر حالت میں حمایت کرنی چاہیئے۔ اور بین السطور میں یہ کہ اسرائیلیوں کے ساتھ فلسطینی "دہشت پسند" وہی سلوک کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں جو نازیوں نے کیا تھا۔ سیاست اور میڈیا کی بے انصافی کی یہ بڑی ہولناک صورتِ حال ہے اور سوچ کر دل ٹوٹتا ہے۔ بسلسلہ مسیحی احساسِ جرم ایک اور بات یاد آئی۔ حال ہی میں پوپ نے اپنے ایک فتوے کے ذریعے قومِ یہود کو "خدا کے قتل" ___ (نعوذ باللہ!) یعنی حضرت عیسےٰ کو مصلوب کروانے کے جرم سے بری الذمہ قرار دیا ہے!

امریکہ میں شیکسپیئر کا ڈرامہ مرچنٹ آف وینس اپنے مشہور یہودی منفی کردار شائی لاک کی وجہ سے اب اسٹیج نہیں کیا جاتا! چنانچہ ٹیلی ویژن پر عرب شخصیات انٹرویو کرنے والوں کا رویہ بھی جارحانہ اور مخاصمانہ ہوتا ہے۔ کبھی نادیا میرا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے فوراً چینل لگاؤ۔ باربرا والٹرز شاہ حسین سے بات کر رہی ہے۔ "یا میں اکساٹمنٹ سے

چلاتی "نادیا یا سرعرفات بول رہے ہیں"

لیکن اس سے قطع نظر بالخصوص پبلک براڈکاسٹنگ سروس کے نفیس پروگرام ہوتے ہیں۔ پی بی ایس پر ایک بیحد خیال انگیز اور ظرافت آمیز سلسلہ MEETING OF THE MINDS چل رہا تھا جس میں کارل مارکس، امریکن شاعرہ ایملی ڈکنسن، تھوریو، روسو، ڈارون، ملکہ میری، انٹوانیٹ ایٹلادی ہن وغیرہ وغیرہ ایک گول میز کے گرد بیٹھ کر ایک دوسرے سے اور آج کے اہل علم سے بے حد پر لطف تکرار اور بحث و مباحثہ کرتے۔

"ان پروگراموں کو دیکھنے کے بعد اپنے مصری ٹیلی ویژن کا خیال آتا ہے" نادیا سرد آہ بھر کر کہتی اور میں اس وقت انڈین ٹی وی کے بارے میں خاموش رہنا مناسب سمجھتی۔ اور سوچتی آخر ہم لوگ اتنے نااہل کیوں ہیں؟ اتنے ذہین اور اتنے نااہل! کہ اسی نااہلی، خود غرضی، گھٹیاپن اور بے ایمانی نے ساری قومی زندگی اور قومی سیاست کو ایک لامتناہی اوپیرا بنا کر رکھ دیا جس کے چند اہم کردار وہی کلیشے دہرائے جاتے ہیں۔ اور پوری قوم یوجین آئینسکو کے ڈرامے "گینڈے" کے کرداروں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔

گینڈا دلدلی جنگلوں میں رہتا ہے اور فطرت کے اولین تجربوں کی یادگار ہے۔ اس کی زرہ بکتر جیسی موٹی کھال میں بندوق کی معمولی گولی سوراخ نہیں کر سکتی۔ وہ دنیا کی سب سے کریہہ المنظر مخلوق ہے۔ وہ محبت کی جبلت سے یکسر عاری، انتہائی احمق اور طاقتور اور جنونی اور مکروہ جانور۔ اسے سجھائی بھی کم دیتا ہے۔ وہ یا تو اندھے پاگل پن کی کیفیت میں حملہ آور ہوتا ہے یا بس اونگھتا رہتا ہے۔

پی بی ایس کے ماسٹر پیس تھیٹر میں ایک شام آئینسکو کا ہولناک شاہکار "گینڈے" دکھلایا گیا تھا جس میں یکے بعد دیگرے سارے کردار گینڈے کی طرح چنگھاڑتے ہوئے گھر سے نکل بھاگتے ہیں۔ اور ——— OFF STAGE دریچے کے ———

باہر گیدڑوں کے غول کے غول اپنی بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ ایک فلیٹ میں جمع لوگ ایک کے بعد ایک جنونی کیفیت میں چیختے ہوئے دریچے سے کود کر اس حیوانی بھیڑ میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ ساری انسانی آبادی گیدڑوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ فقط ایک آخری آدمی رہ جاتا ہے۔

...:...

مَیں نے ابھی کالے لیڈروں کا ذکر کیا تھا جو قومی زندگی میں نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ اسلام بھی اپنی مساوات کی وجہ سے ایک حد تک کالوں ہی میں کامیاب ہُوا ہے۔ یونیورسٹیوں میں تھوڑا بہت "NEW LEFT" بھی پیدا ہو چکا ہے۔ خصوصاً وسیع المشرب کیلی فورنیا میں۔

۱۴ر نومبر کو میں مغربی ساحل اور جنوبی ریاستوں کے لئے روانہ ہو رہی تھی۔ اس سے قبل یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے کے ڈپارٹمنٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے ڈائریکٹر پروفیسر بروس پرے نے وہاں کا پروگرام طے کرنے کے فون کیا۔ کہنے لگے "اس درس گاہ میں چالیس ہزار طلبا پڑھتے ہیں۔ مگر کیا عجیب اتفاق ہے کہ کل شام کیمپس پر ایک پارٹی میں ملاقات آپ کی بھانجی زیبا حیدر سے ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ آپ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں ٹھہرنے کی بجائے ان کے ساتھ قیام کو ناپسند کریں گی۔"

"آپ کو اردو آتی ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مَیں یہاں اردو ہی پڑھاتا ہوں۔ تین دن کے لئے نیویارک سے جتندر کمار جین بھی آنے والے ہیں۔"

مَیں نے بات کاٹی "کمال ہے کہ زیبا سے آپ کی ملاقات ہو گئی جبکہ وہ برکلے میں پڑھتی بھی نہیں۔ کیا دنیا اتفاقات کا ایک عجیب و غریب سلسلہ نہیں؟"

سن شائن اسٹیٹ

ایک بار پھر شکاگو۔ دوسرا طیارہ برائے ڈینوز جو ریاست کولوریڈو کا بہت بڑا شہر ہے۔ اب سرخ چیٹیل کوہستانوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈینوز سے مغرب بعید کی سمت جاتے ہوئے محض سرخ پہاڑ اور وسیع، پتھریلی وادیاں۔ اچانک سرسبز کیلی فورنیا یڈ ویسٹ میں سردی پڑنے لگی تھی کیلی فورنیا دھوپ سے معمور تھا۔ پچھلی صدی میں گولڈ رش کے دوران سیرا نیوادا میں سونے کی کانیں دریافت کرنے والوں نے سان فرانسسکو بسایا تھا وہ لوگ فورٹی مائنر کہلاتے تھے جنہوں نے ۱۸۴۹ء میں گولڈ رش شروع کیا۔ کالج میں ہم لوگ ایک پرانا امریکن گیت گاتے تھے

DWELL A MINER, FORTY NINER, GAD A DAUGHTER CLEMENTINE

یہ کبھی رومانس اور لیجنڈ کا شہر ہے۔ سارے امریکہ کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہاں کے باشندے طرح طرح کے کارنیوال مناتے ہیں اور اپنی خوش باش زندگی کے لیے مشہور رہیں۔

سان فرانسسکو کے نزدیک اوک لینڈ کی طیران گاہ پہ چچا زاد بہن خالدہ حیدر کی لڑکی زیبا مع اپنی پاکستانی دوست کو کب۔ زیبا کون کورڈیا یونیورسٹی مونٹریال

(کینیڈا) سے ماسٹر آف بزنس ایڈ منسٹریشن کے امتحان میں پانچ سو طلبا میں اول رہی تھی۔ اور سان فرانسسکو کے ایک فاسٹ فوڈ چین اسٹور کی مینیجر بن چکی تھی۔

کوکب نے زیبا کی کار اسٹارٹ کر کے فراٹے سے برکلے کی سمت جانے والی فری وے پر چھوڑ دی۔ یہ نوعمر پاکستانی لڑکیاں انتہائی خود اعتمادی اور اطمینان کے ساتھ سان فرانسسکو میں اپنے اپنے کیریئر شروع کر رہی تھیں اور قریب کے شہر ماؤنٹین ویو میں ایک بنگلہ کرائے پر لے کر رہتی تھیں۔

امریکہ میں دو ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔ ہر ریاست میں سرکاری یونیورسٹیوں کا ایک COMPLEX ہے۔ "یونیورسٹی آف کیلیفورنیا" اس ریاست کے چھ شہروں میں اسی نام سے موجود ہے۔ مشہور عالم لبرل یونیورسٹی آف کیلیفورنیا برکلے" کا حسین اور پُر فضا کیمپس۔ خود شہر سان فرانسسکو دنیا کے حسین ترین شہروں میں سے ایک سرسبز پہاڑیاں، اونچے نیچے بل کھاتے راستے مورش ہسپانوی طرز کے مکانات، عظیم الشان ڈاؤن ٹاؤن، تیز نیلا بحرالکاہل۔

منصور العارفین برکلے میں کیمپس کے نزدیک پارکر اسٹریٹ نامی ایک خوش منظر محلے کے اندر ایک نفیس اپارٹمنٹ میں اپنے ساتھی طالب علم یونس کے ساتھ رہتا تھا۔ یونس پاکستان کے سب سے بلند پایہ قائدِ اعظم اسکالرشپ پر ریاضی پڑھنے آیا تھا۔ دونوں بے حد ذہین، نیک اور خوش مزاج لڑکے تھے۔ منصور العارفین جو لاہور میں کنڈر گارٹن کلاس سے زیبا کا ہم جماعت رہا تھا برکلے میں پڑھنے کے علاوہ جز وقتی ملازمت بھی کر رہا تھا ایک شام ان کے ہاں آئے ہوئے ایک ہندوستانی طالب علم نے مجھ سے کہا۔ بتائیے۔ ہمارے پتاجی کی ہر پندرھویں روز چٹھی آتی ہے، کہ واپس آجاؤ واپس جا کر جوتیاں چٹخائیں؟ جتنا یہاں پڑھا ہے اس کے لحاظ سے منتریوں کی سفارش لانے پر سات آٹھ سو کی نوکری ملے گی یا نہ بھی ملے۔

یہاں پارٹ ٹائم کام کرکے بھی اتنا کما لیتے ہیں کہ ایسے اچھے اور فرنشڈ اپارٹ
کرائے پر لے لیتے ہیں۔ مع وال ٹو وال کارپٹ بڑھیا فرنیچر مستقل گیس، فریج
ٹیلیفون لگوانے کے لئے صبح بل کمپنی سے کہو۔ چھ گھنٹے کے اندر اندر ان کا آدمی
ٹیلیفون لگا جائے گا۔ بمبئی میں اپارٹمنٹ کتنا مہنگا ملے گا؟ اور وہ بھی خالی۔
فرنیچر۔ بنا گیس۔ یہاں سکالروں کی کوئی کمی نہیں۔ اسٹوڈنٹ لوگ اس ٹھاٹھ سے ر
ہیں، جب ہر طرح کی آسائش یہاں موجود ہے تو ہم واپس جاکر پیارے دیش میں ک
بھاڑ جھونکیں۔؟"

"گھر یاد نہیں آتا۔؟" میں نے پوچھا۔

" بہت یاد آتا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی سب۔ یہی تو ہم لوگوں کا یہاں ڈیلا
ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

پارکر اسٹریٹ سے کچھ فاصلے پر نہایت کلرفل بازار تھا۔ بیفکر البشاش ما
لوگ باگ بانسر گٹار منڈولین بجاتے پھر رہے تھے۔ اپاہج طلبا اپنی موٹر کرسیوں
مزے سے گھوم رہے تھے۔ ایک اپاہج نوجوان اپنی مخصوص کار خود چلاتا ہوا آ
بغیر کسی کی مدد کے خود اپنے کل پرزوں پر چلتا ہوا کار سے اُتر کر کتابوں کی دوکا
داخل ہو گیا۔ کیمپس پر ایک آرکیڈ میں ایک کالا طالب علم میوزک سامنے رکھے
وائلن پر کوئی کلاسیکل نغمہ بجا رہا تھا۔ وائلن کا کیس سامنے کھلا رکھا تھا۔ سامنے
گزرنے والے طالب علم ٹھٹھک کر سنتے کیس میں چند سکے رکھتے اور آگے چلے جاتے و
اپنی موسیقی فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ یہ گویا اس کا جز وقتی پیشہ تھا۔

کیلی فورنیا بلحاظ سائنس اور ٹیکنالوجی باقی سارے امریکہ سے آگے ہے
ہی آزاد منش فنکاروں اور ادیبوں کا اڈا ہے۔ سان فرانسسکو نیویارک اور
کی طرح بڑا ادبی اور صحافتی مرکز ہے۔ سارے انوکھے دل چلے مشرب بھی یہیں

ہوئے، ہندو آشرموں کی افراط۔ بھانت بھانت کے ایکزوٹک قائد کے
ہپی سب سے پہلے یہیں نمودار ہوئے تھے۔ یونیورسٹی آف کیلفورنیا برکلے
اد خیالی کے لئے مشہور ہے۔ ایک صبح اس کے چوک میں ہائیڈ پارک لندن
جگہ جگہ مختلف مسائل پر دھواں دھار تقریریں کی جارہی تھیں۔ چہار طرف
رح کے پوسٹر لگے ہوئے تھے ایک سمت کے لب یعنی ہم جنسوں کی آزادی
بردار اپنے اسٹال سجائے بیٹھے تھے اور اپنے پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے۔ یونین
ن کے سامنے جم غفیر۔ شاہ مخالف مظاہرہ۔ دھواں دھار تقریریں۔ لڑکے اور
، درختوں پر چڑھے بیٹھے تھے "انسانیت کش شاہ ایران کو امریکہ سے واپس
کے پرچم اور پوسٹر ایک لڑکی "کمیونسٹ پارٹی آف یو ایس اے" کا پمفلٹ
ہاتھ میں تھما کر آگے بڑھ گئی۔ تہران میں یرغمالیوں کی نظر بندی کا دسواں یا
، روز تھا اور سارے ملک میں ایک چرچا تھا۔

ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کی عمارت کے سامنے گھڑیال نے گجر بجایا" روز دوپہر
ِ گھر باری باری ان سب ملکوں میں سے ایک کی قومی دھن بجاتا ہے جن کے
یہاں پڑھ رہے ہیں" زیبا نے بتایا۔ "کل پاکستان کی قومی دھن بجی تھی"
نوان طالب علم ذوالفقار علی بھٹو اسی کیمپس پر گھومتے تھے۔ اس بات کو
اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اور وہ جلاوطن محمد رضا پہلوی جن کے خلاف سامنے
اسٹوڈنٹس یونین کے چوک میں احتجاجی جلسہ ہو رہا تھا۔ محض چند سال
تے اعلیٰ حضرت شہنشاہ آریہ مہر/ وزیر اعظم پاکستان ـــــ بھٹو سے ملنے
وزٹ پر کرتہ و فرح دیبا کے ساتھ پاکستان جاتے تھے اور بھٹو کی زمینداری
لاڑکانہ میں شکار کھیلتے تھے۔ کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا

گھنٹہ گھر کے نزدیک ایک خوبصورت پل کے نیچے پہاڑی نالے کا پانی بہتا جا
ڈاکٹر بروس پرے کے دفتر کے کلیسائی دریچوں کے باہر اونچے درخت خوشنگ
دھوپ میں نہا رہے تھے۔ کمرے کے اندر اردو کے چند امریکن طالبعلم پچا
کے سزایافتہ دہشت پسندوں کے متعلق سوالات کرنے میں مصروف تھے۔
کا تذکرہ "آخر شب کے ہمسفر" میں کیا گیا تھا۔ (ڈاکٹر بروس پرے نے وہ مضمون
اپنے امریکن شاگرد مارٹن کو زیروکس کرکے لانے کے لئے کہا)۔ مارٹن پل کی ب
میں غائب ہو گیا۔
اتنی خوبصورت، سہانی، دلچسپ، مسرت بخش، فرحت انگیز دنیا اور چند
انسانوں کو چند انسان سیاست کے نام پر پھانسی دے کر، گولی سے اڑا کر، ن
بم پھینک کر، خنجر بھونک کر اس عالم رنگ و بو سے معدوم کر دیتے ہیں آخر کیا
ایران میں پچھلے برسوں میں کتنے مارے گئے۔ اور اب بھی کتنے مارے جا رہے
تھے۔ بساطِ ارض پر ہر جگہ، شانتی۔ شانتی۔ چند امریکن سوامی مالا جپتے باہر نالے
کے پل پر سے گزر گئے۔ "یہاں برکلے میں ایک ماتاجی بھی نمودار ہو گئی ہیں" دو
کو کیمپس کے ایک جھلملاتے ریسٹوران میں لنچ کی میز پر جتندر کمار جین نے مجھ
کہا۔ "کوئی تعجب کی بات نہیں ہے" میں نے جواب دے دیا۔
امن۔ ہر قیمت پر امن حاصل کرنا چاہیئے۔
تو فلسطینی مجاہد؟ کویکرز کے پاس بھی اس مسئلے کا حل کیا ہے؟
اس پلیٹ گلاس طعام خانے کے باہر سرسبز سرسراتے جنگل پر بارش کی جا
پھوار پڑ رہی تھی۔ دور سرمئی راستے پر کیمپس پولیس کی پٹرول کار گشت کرتی نکل گئ
طعام خانے کے مقابل میں اسٹوڈنٹس یونین کی یونانی عمارت کے چوک میں معزو
شاہِ ایران کے خلاف جلسہ جاری تھا۔ میں اس جلسے کی تصویریں لیتی مگر ا

ہ گھر بھول آئی"۔ میں نے کہا۔" مجھے کنجی دیجئے میں جا کر لے آتا ہوں"۔ مارٹن نے
۔ زبیل نے اسے کنجی دے کر منصور العارفین کے اپارٹمنٹ کا پتہ اور اندر کا
نقشہ سمجھایا۔ لونگ روم سے گیلری میں جا کر بائیں دروازے میں داخل ہو جاؤ۔
رش پر بہت سا سفری اسباب بکھرا نظر آئے گا۔ اس میں کیمرہ تلاش کر لینا۔ آسان
ت ہے"۔

مارٹن نے ہوشمندی سے سر ہلایا اور ترنت کیمرہ لے کر واپس آیا۔ کھانے
ے بعد اس نے "پت جھڑ کی آواز" کی ہیروئن "تنویر فاطمہ" کی ابنارمل نفسیات کے متعلق
ین سوالات کئے۔ ادھر جیتندر کمار جین راجن کے اور راقم الحروف کے لئے پنچ
گیا تھا) فصیح و بلیغ اردو بول رہے تھے۔ موصوف تین دن کے لئے نیویارک سے
ئے ہوئے تھے۔

مغرب اور سوشلسٹ ممالک کی یونیورسٹیوں میں جو طالب علم برصغیر کی زبانیں
ھنا شروع کرتے ہیں وہ اکثر اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ نامور ہندی ادیب جب
ی طور پر بات چیت کرتے ہیں تو بے ساختہ اور لا محالہ اردو بولتے ہیں۔ لیکن اردو
جو صورتِ حال ہے تو بے۔ عبرت۔ عبرت۔ پریذیڈنٹس روم میں (جس کی دیوار
یونیورسٹی کے سابق پریذیڈنٹوں کی تصاویر آویزاں تھیں) منعقد راقم الحروف
۔ سیمینار کے لئے (جس کا اعلان سان فرانسسکو کرانیکل میں چند روز قبل کیا
گیا تھا) کافی سامعین موجود تھے ہاردو والے نازاں ہیں۔ آہاہا۔ دیکھئے صاحب
ب میں بھی لوگ اردو پڑھ رہے ہیں۔ بنکاک یا قاہرہ یا بغداد کی یونیورسٹیوں
اردو پڑھائی جائے تو اتنے مرعوب نہ ہوں گے۔

سیمینار سے قبل پروفیسر بروس پرے نے لسانیات کے دار العمل میں کار جہاں
ہے۔ (جلد اول) کے دو طویل ابواب" باغی سپاہی" اور کچا پلٹن اور کچا پائے مورتہ

ریکارڈ کروائے اور مارٹن نے لکھنؤ کے تلفظ کے متعلق پوچھا۔ یہ الگ بات
دلی اور لکھنؤ دونوں کے تلفظ معدوم ہونے والے ہیں۔
سان فرانسسکو ایک پرستانی شہر ہے۔ ابھی خیال آیا کہ اس کے ایک مع
بھی ہو سکتے ہیں۔ امرودوں کو انگلستان میں FAIRY کہتے ہیں۔ سان فرا
سُنا ہے ہر ساتواں شخص GAY ہے۔ اردو میں اس قسم کے لوگوں کو "جنت کی چ
کہا جاتا تھا دیجانے اس کی وجہ تسمیہ کیا تھی شہر میں پرانا رومینٹک ماحول قائم رکھنے
لئے چند سڑکوں پر ٹرام گاڑیاں باقی رکھی گئی ہیں۔ زیبا اور میں ایک ٹرام گاڑی پر چ
اس نے ٹن ٹن کر کے چڑھائی پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ زیبا بیگم جو مسلسل
تصویریں کھینچتی رہتی تھیں اچانک چلتی ٹرام سے سڑک پر اتریں تصویر کھینچی اور
کر۔۔ اوپر آگئیں۔ میں نے خوب ڈانٹا "اور نہ ہوئے اس وقت بشیر خاں ڈرائیور
زمین آسماں ایک کر دیتے"۔ میں نے کہا۔ "آپ کی والدہ محترمہ کے ہنسکار نے پر
والی کار کے پیچھے لگیج کیریئر میں ان کے ساتھ بیٹھ گئی تھی"۔
"لگیج کیریئر۔؟" زیبا نے اپنی والدہ محترمہ کی طرح آنکھیں گول کر کے پوچھا۔
"ہاں اس زمانے میں ڈِگی کے بجائے ہوتا تھا۔ ہمارا لگیج کریر بہت چوڑا تھا
لوگ اس پر چڑھ کر بیٹھ گئے بُری طرح حادثہ ہو جاتا۔ بشیر خاں نے ایک راہ گیر کے
پر کار روکی اور خوب جھاڑا۔" فرانسسکو واپس پہنچے جب ٹرام گاڑی پولک ا
کے نزدیک رکی۔ پولک اسٹریٹ شہر کے GAY لوگوں کی آماجگاہ تھی۔ ان کی ا
گاہیں شراب خانے، کتابوں اور رسالوں کی دوکانیں (ایک چینی کتب فروش کی
کے دریچے میں PLAY BOY کی قسم کے اَن گنت CAKE رسالے رکھے ہوئے
ان کے مخصوص فیشن کی ملبوسات کے ڈیپارٹمنٹ اسٹور اور ریسٹوران۔
دوسرے روز ہم لوگ سان فرانسسکو سے چند میل دور ایک حسین یوریپ

لی شہر ساسلیٹو گئے۔ وہاں ایک ریسٹوران کے دریچے میں چند خواتین سی بیٹھی نظر
۔ دوبارہ غور سے دیکھا وہ سب حضرات تھے۔ واپسی پہ رات کو سان فرانسیسکو کی
نیم تاریک رقص گاہ میں جھانکا، وہاں رنگ برنگی متحرک روشنیوں میں مرد مردوں
ساتھ ڈسکو رقص کر رہے تھے۔ بڑا بھیانک سا ماحول تھا۔ لیکن ہمیں مغرب کے
اخلاقی زوال پہ اپنے اخلاقی برہمی کے اظہار کرنے سے پہلے روایتی فارسی اور
یتی اردو شاعری پڑھ لینی چاہیئے۔

"سنا ہے برکلے میں ایک لزبین بار بھی موجود ہے۔ لگے ہاتھوں وہ بھی دیکھتے چلیں"
نور العارفین نے برکلے کی سمت کار موڑتے ہوئے کہا۔ سان فرانسسکو کی یہ ۸۷ ء
باقاعدہ ٹورسٹ اٹریکشن بن چکی ہے" اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ برکلے
ں پہنچ کر ہم لوگ اس بار کا پتہ نشان ڈھونڈتے پھرے۔ ایک سنسان سڑک پر ایک
وٹی سی عمارت کے سامنے ایک ٹرک کھڑی تھی۔ برجس میں ملبوس سیاہ مردانہ فیلٹ ہیٹ
ی لگائے ایک خاتون ایک دروازے سے نکلی اور ٹرک اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گئی۔

ایک عورت دروازے کے سامنے جھاڑو دے کر شکستہ بوتلیں سمیٹ رہی تھی۔ ایک خوش
لی لڑکی چست مردانہ لباس پہنے (جو عام لڑکوں اور لڑکیوں کی جینز یا سلیکس سے مختلف
) سر پہ سیاہ مردانہ ہیٹ ترچھی لگائے چیلو کا کیس سنبھالے سڑک پار کر کے اس دروازے
پہنچی۔ جھاڑو والی عورت بڑبڑائی "کیا ہوا؟" نو وارد لڑکی نے پوچھا" برابر کی دکان والے
ا کچرا اور ٹوٹی بوتلیں جان بوجھ کر یہاں پھینکتے ہیں" جھاڑو والی نے جواب دیا۔
"سوٗر کے بچے" چیلو بجانے والی لڑکی بولی، اور اندر چلی گئی۔ بعض اوقات کسی منظر
رف ایک جھلک یا چند الفاظ ایک صورتِ حال کو منکشف کر دیتے ہیں۔ ظاہر تھا کہ
ں پڑوس کے لوگ اس کلب کو ناپسند کرتے تھے۔

کار سے اتر کر ہم چاروں ذرا تذبذب میں تھے ۔ مدر کس طرح جائیں۔ صاف پتہ

چل جانا کر ان لوگوں کو ایک عجوبہ سمجھ کر بطور سیاح انہیں دیکھنے آئے ہیں۔ ہمت کر کے میں زیبا اور منصور العارفین اور یونس اندر گئے۔

بار پر دو اداس صورت لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک موٹے شیشوں کی عینک لگائے کم رُو بھدّی سی لڑکی تھی۔ دیواروں پر ویمنز لب تحریک کے زیر قیادت دیئے جانے والے لیکچروں مذاکروں اور فلم شوز وغیرہ کے پوسٹر لگے تھے۔ "یہ بڑا غضب ہوا کہ ویمنز لب تحریک یہاں ایک حد تک لزبین خواتین کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔" زیبا نے کہا

کلب خالی پڑا تھا۔ بلیرڈ کی میز کے قریب چیلو بجانے والی لڑکی اپنا ساز درست کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ کوارٹیٹ کی باقی ارکین ابھی نہیں آئی تھیں۔ شاید وہاں موسیقی کا پروگرام ہونے والا تھا۔ بار پر بیٹھی خواتین نے ہمیں ناگواری سے دیکھا۔ منصور العارفین اور یونس بالکل دشمن علاقے میں کھڑے تھے۔ "چلو واپس چلیں۔ آئیڈیا ہو گیا۔" میں نے کہا۔ ہم چاروں جو دراصل خاصے نروس تھے۔ باہر آئے۔ جھاڑو والی کوڑا اسمیٹ کر جا چکی تھی۔ اسٹریٹ لیمپوں کی پیلی بیمار روشنی میں سڑک اور زیادہ افسردہ اور بیمار معلوم ہو رہی تھی۔

سان فرانسسکو شہر میں ہیٹ ایشبری کا محلہ بھی اب خاموش پڑا تھا۔ پندرہ سال قبل جہاں سے ذیلی کلچرز اور آزاد رویوں کے یہ سارے غلغلے اٹھے۔ اسی محلے کے باغیوں نے سارے مغرب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ہپی۔ فلاور چلڈرن۔ ایل ایس۔ ڈی کھانے والے ہمجنسوں کی آزادی کے علمبردار ہرے کرشنا والے سبھی کا اس محلے میں ظہور رہا۔ اب وہ خط بہت باعزت ہو گیا تھا۔ وہ باغی امریکہ اور مغرب کی سماجی تاریخ میں اپنا احتجاجی رول ادا کر کے غائب ہو گئے۔ ایلن گنزبرگ جس کی معرکۃ آرا طویل نظم HOWL نے مڈل کلاس امریکہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ان سر پھروں کا گرو تھا، احتجاج کی اب ضرورت نہیں رہی۔ دس پندرہ سال کے اندر اندر

وہ سارے جدید رویئے اب امریکن زندگی کے مرکزی دھارے میں شامل ہو چکے تھے۔ مڈل کلاس منافقت کے خلاف جو زبردست احتجاج اس نئی نسل نے کیا تھا وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔

فرشتوں کی ملکہ مریم کا شہر

اہلِ ہسپانیہ نے بسایا تھا۔ ایل پیوبلو دی نیوترا اسینورا لا رینا دی لاس اینجلز۔
ہماری بی بی ملکۃ الملائیکہ کا شہر" امریکہ اور میکزیکو کی جنگ کے بعد صلح نامے کی زد
سے امریکہ نے اس شہر اور سارے کیلیفورنیا پر قبضہ کر لیا۔ امریکہ کی قومی اساطیر
میں پلگرم فادرز ریڈ انڈین قبائل کے خلاف لڑائیاں، پائینرز۔ کاؤبوائے۔ وائلڈ ویسٹ
کی آبادکاری گولڈ رش امریکن خانہ جنگی حبشی غلاموں کی آزادی وغیرہ شامل ہے جسے
مارک ٹوین، برٹ ہارٹ، دوسرے ناول نگاروں اور بعد میں ہالی وڈ فلموں میں پیش
کیا گیا۔ اسی گولڈ رش کے لئے ہزارہا چینی بحرالکاہل عبور کر کے کیلیفورنیا پہنچا تھا۔
" غریب میکزکن اب بھی متواتر سرحد پار کر کے تلاش روزگار میں لاس اینجلز آتے
رہتے ہیں۔" میرے بھتیجے منصور حیدر نے کہا کہ ہم لوگ لاس اینجلز ایئرپورٹ سے
بہت دور نارتھ ہالی ووڈ کی طرف جا رہے تھے۔ یہ شہر بہت بڑا ہے مگر سان فرانسسکو
جیسا خوبصورت نہیں۔ میں نے اظہارِ خیال کیا شمالی ہالی ووڈ کے ایک خوبصورت رہائشی
علاقے میں ہسپانوی طرز کے سُرخ کھپریل والے سفید دو منزلہ مکان میں میرے بھتیجوں کا
اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔ داخلے کے ہال میں بھورا دبیز قالین۔ بڑھیا صوفے نفیس
جالی کے پردے۔ اُوپر اسی طرح کا اپارٹمنٹ جیسا سان فرانسسکو میں منصور العارفین

کا تھا۔ میرے بھائی سید مصطفیٰ حیدر کے تین بڑے لڑکے یہاں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس اینجلز میں زیرِ تعلیم تھے اور جزو وقتی ملازمتیں بھی کر رہے تھے۔ ان کی بڑی بہن ناہید اسی شہر کی یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا میں ڈیڑھ سال ٹیکس ایڈمنسٹریشن پڑھ کر اپنی سی۔ ایس۔ پی کی ملازمت پر کراچی واپس جا چکی تھی۔ اس سے چھوٹا جلال حیدر (سی۔ ایس۔ پی) جو کراچی میں مجسٹریٹ تھا۔ پندرہ ماہ کی چھٹی لے کر بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے آیا تھا۔ منجھلے اور چھوٹے عدنان حیدر اور منصور حیدر انٹرنیشنل فنانس وغیرہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ وہ زمانے لد گئے جب برصغیر کے نوجوان شیکسپیئر اور ارسطو کے مطالعے کے لئے انگلستان جاتے تھے۔

بچوں کے باورچی خانے کے دریچے میں سے دُور ایک پہاڑی پر سفید حروف میں HOLLYWOOD لکھا صاف نظر آتا تھا۔ مکان سے کچھ فاصلے پر سانتا مونیکا سان مارینو وغیرہ جانے والی سڑکوں کے بورڈ لگے تھے۔ ذرا فاصلے پر سن سیٹ بولیوار تھی۔ معقول لڑکپن میں ان جگہوں کے نام بڑے سحر انگیز لگتے تھے۔ سان فرنانڈو ویلی۔ جان اسٹین بک وغیرہ کے ناولوں میں اس کا ذکر بہت پڑھا۔ وہ وادی سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ دو پہاڑیوں کے درمیان کھلی فضا کے یونیورسل ایمفی تھیٹر میں ساڑھے پانچ ہزار سیٹیں تھیں اور سٹیج پر فرینک سناٹرا۔ ڈونا سمر، کینی راجرز وغیرہ شام کو اپنے شو پیش کرتے تھے۔ ایک صبح یونیورسل سٹی میں سیاحوں کی طویل قطاریں اندر جانے کی منتظر تھیں۔ بچوں کے ساتھ قطار میں اپنی "گلیمر ٹرین" کی باری کی منتظر تھی جب اچانک فرینک اسٹین سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ سہم کر رہ گئی۔ وہ مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ سبز رنگ کا میک اپ کیسے بے حد طویل القامت دیو ہیکل فرینک اسٹین اس مستقل تماشے کا ایک کردار تھا۔

گلیمر ٹرین ساری یونیورسل سٹی کا چکر لگاتی ایک سرنگ میں داخل ہوئی اچانک LASER

شعاعیں چمکنے لگیں۔ سائنس فکشن کے متعدد کردار فولادی اسپیس سوٹ پہنے ٹرین کی طرف لپکے۔ بھیانک دھماکے۔ طرح طرح کی آوازیں۔ آؤٹر اسپیس کے ایک جہاز نے ٹرین کا راستہ روک لیا۔ LASER توپیں چلیں۔ ٹرین کا کنڈکٹر خوفناک آواز میں بولا۔ "مسافرو۔ بڑا افسوس ہے کہ ہم ایک غیر متوقع مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ لیکن فکر نہ کیجئے۔" (پھر بندوقیں چلیں) ایک سو بیس سیاحوں سے بھری گلیمر ٹرین ایک F-5-U پر چڑھ گئی۔ بلیپ، بلیپ، روشنیاں۔ ٹرین مصنوعی خلا میں پرواز کرنے لگی۔ سیاروں کی جنگ شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد ٹرین سرنگ سے باہر نکلی (یہ سارا ماجرا یونیورسل پکچرز کی فلم ——— BATTLE OF GAIACTICA کا تھا جسے روزانہ ان ہزاروں سیاحوں کے لئے اس سرنگ میں کئی بار دہرایا جاتا تھا جن کی "گلیمر ٹرینیں" ایک کے بعد ایک ساری یونیورسل سٹی کے عجائب و غرائب کی سیر کرواتی رہتی تھیں۔

ہماری ٹرین اب ندی کے اونچے چوبی پل پر چڑھی۔ وسط میں پہنچتے ہی پل "ٹوٹ" گیا۔ ٹرین ایک دھچکے سے ٹوٹتے ہوئے راستے پر سے نکل کر "بحیرہ احمر" پر آئی۔ یہ جھیل ——— TEN COMMANDMENTS فلم کے لئے بنائی گئی تھی۔ اچانک پانی کے دو حصے ہوئے اور ٹرین حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرح "بحیرہ احمر" میں سے نکل گئی۔ ایک اور جھیل پر پہنچے جس کے اندر "JAWS" والی شارک پڑی ہوئی تھی۔ دور جھیل کے وسط میں آدمی ناؤ میں بیٹھا تھا۔ مصنوعی شارک نے اس پر حملہ کیا۔ مصنوعی آدمی پانی میں گر پڑا۔ خون کا فوارہ اُبلا۔ اب شارک منہ کھول کر ہماری طرف لپکی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اصل شارک نہیں۔ ٹرین جھیل کے کنارے سے آگے بڑھی۔

یہ سارے تماشے متواتر بالکل صحیح وقت پر دکھائے جاتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کی بھول چوک نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر اس شارک سے میکینکل حرکت اور رفتار میں ذرا سی بھی غلطی یا دیر ہو تو یہ ٹرین سے ٹکرا سکتی ہے۔" لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔" جلال میاں نے

کہا۔" سرنگ میں جب وہ مریخ کا آدمی ٹرین کی طرف بڑھا اور LASER تو پیں چلیں تو چند سیکنڈ کے لئے مجھے بھی ڈر لگا تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔

اب ہم لوگ وائلڈ ویسٹ کے ایک پچھلی صدی کے شہر میں سے گزر رہے تھے جس میں سینکڑوں کاؤ بوائے فلم بن چکے تھے۔ ایک دو منزلہ مکان میں مستقل آگ لگ رہی تھی اور ایک مصنوعی کاؤ بوائے اوپر سے کود رہا تھا۔ اس کے بعد یورپ کے مختلف شہر۔ جھیلیں۔ قرونِ وسطیٰ کے قلعے۔ ٹرین سے اتر کر ہم لوگ ایک مستقل سیٹ پر گئے۔ جہاں ایک جمبو جیٹ رکھا تھا جو گویا پانی میں ڈوب رہا تھا۔ ڈائرکٹر نے ناظرین میں سے چند کو اوپر بلایا اور ان کو سمجھا کر جمبو جیٹ کے اندر فلم بندی شروع کی۔ چند منٹ بعد وہیں ٹی وی اسکرین پر وہ پورا سین دکھلا دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ اصل فلم کے انٹرکٹ دکھلائے گئے جن میں جیک لیمن اور ڈیرن مک گیون نے کام کیا تھا۔ اصل فلم کے مناظر اور ان کی نقل میں کوئی فرق نہ تھا۔

سارا ہالی ووڈ کا "پیالہ" یعنی گول وادی اور اس کے چاروں طرف پہاڑ یونیورسل سٹی کے اوپر کھلے ریسٹوران سے نظر آتے ہیں۔ ریسٹوران میں ہر میز پر قیمتی کاغذ KLEENAX رومالوں کے بڑے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ (یہ ڈبے ہر امریکی گھر کے ہر کمرے میں بھی موجود ہوتے ہیں) اس وسیع کھلے ریسٹوران میں جہاں سینکڑوں لوگ آجا رہے تھے۔ کوئی یہ ڈبے چرانے والا نہ تھا۔

ایک مرتبہ کراچی میں مشہور کرکٹ کمنٹیٹر اور صحافی عمر قریشی نے (جو برکلے میں ذوالفقار علی بھٹو کا ہم جماعت رہ چکا تھا) مجھے بتایا تھا کہ جب وہ یو سی ایل اے میں پڑھتا تھا تو وہ اور اس کے خوش شکل ساتھی ہالی ووڈ فلموں کا خصوصاً۔ BIBLICAL EDIES میں (جن کا ان دنوں بہت زور تھا) چھوٹے چھوٹے

رول کر لیا کرتے تھے۔ جس کے ان کو بہت پیسے ملتے تھے۔ اسی ریسٹوران میں کچھ دیر بعد تینوں بچے مزید کافی وغیرہ لانے کے لئے دکانوں کی سمت گئے۔ قریب کی میز پر تنہا بیٹھی ایک حسین لڑکی نے توصیفانہ نظر ان پر ڈال کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ جواباً میں بھی مندرجہ ذیل مکالمہ :۔

"یہ بیحد ہینڈسم نوجوان یہاں اداکار ہیں؟"

"نہیں!"

"کون ہیں؟ ہسپانوی۔ اطالوی؟"

"پے کستین"

لڑکی۔ بلینک۔ پھر "ان کو یہاں ڈسکور کر لینا چاہیئے"۔

"ان بے حد ذہین اور پڑھائی کے شوقین بچوں کو فلموں میں کام کرنے کا قطعی شوق نہیں۔ کیا تم ٹیلنٹ اسکاؤٹ ہو؟"

لڑکی (ٹھنڈا سانس) "نہیں۔ یہاں کام کی متلاشی۔ آپ؟"

"میں؟ (پر اسرار توقف) خاتون لاما"۔

لڑکی بلینک

"لاما۔ بدھسٹ سوامی!"

"اوہ۔ لیڈی گورو۔!"

میں: مشفقانہ، روحانیت سے پُر مسکراہٹ چہرہ پُر نور۔

لڑکی: اچانک دلچسپی ایں برازیل سے آتی ہوں۔ کیا میں یہاں کامیاب ہوسکوں گی؟ یعنی کراوڈ سین کے علاوہ؟

میں: ہو بھی سکتی ہو اور نہیں بھی۔ یہ اس آدمی پر منحصر ہے۔ جو شمال سے آئے گا۔ قد بہت لمبا ہوگا۔ سرخ بال۔ بائیں کنپٹی پر زخم کا نشان اور اس کے نام کا پہلا

حرف اپیل ہوگا۔"

بچے واپس آئے۔ یہ عجیب وغریب مکالمہ کان میں پڑا۔ اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ اتنے میں اس بیچاری کا خرانٹ ساساتھی آگیا اور یہ تگالی میں اس سے تیز تیز بولنے لگا۔ مجھے اسٹین بیک کے ناول THE WAYWARD BUS کی غریب لڑکی یاد آئی جو کلارک گیبل پر عاشق تھی اور ہالی وڈ پہنچ کر اسٹار بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

ڈزنی لینڈ دنیا کا "مسرور ترین مقام" کہلاتا ہے۔ اور اس کی سیر کے لئے کم از کم ایک ہفتہ درکار ہے۔ اسی وجہ سے دور دور سے لوگ آکر ڈزنی لینڈ ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ جو ایک برق رفتار مونوریل کے ذریعے اس حیرت ناک جگہ سے ملحق ہے۔ وہ مونوریل ایک بہت اونچے پل پر ایک پٹڑی پر زنائیں زنائیں چلتی رہتی ہے۔ یہ اتنی تیزی سے ترچھی ترچھی چل رہی ہے کہیں گر نہ جائے۔" میں نے نیچے سڑک پر کھڑے ہوکر فکر مندی سے کہا۔" پھوپھی آپ کا مزاج بالکل مکینکل نہیں ہے۔ فکر نہ کیجئے یہ ریل بالکل نہیں گرے گی۔" عدنان میاں ہنس کر بولے۔ نیچے کار پارک میں امریکن سیلانیوں کی ہزار ہا کاروان کاریں موجود تھیں۔ ان متحرک پر تکلف گھروں میں وہ دوسرے شہروں سے اپنے بچوں کے ساتھ ڈزنی لینڈ آئے تھے۔

ڈزنی لینڈ کے اندر" واشنگٹن ڈی سی" میں ابراہیم لنکن کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں زبردست ریوالونگ اسٹیج پر والٹ ڈزنی کے سارے بولتے گاتے ناچتے جانور، پلوٹو گوفی ڈونلڈ ڈک وغیرہ وغیرہ مزاحیہ ڈرامہ پیش کرنے میں مصروف تھے۔ ہر پتلا میکینکل اور الیکٹرونک تھا۔ ایک جگہ امریکن تاریخ کے سارے ادوار یکجا کر دیئے گئے تھے۔ "مین اسٹریٹ" میں گھوڑے والی ٹرامیں چل

رہی تھیں۔ ایک سینما ہال میں خاموش فلم دکھائے جا رہے تھے۔ فینسی لینڈ میں اسنو وائٹ اور لونے ایلس کا پورا ونڈر لینڈ، سلیپنگ بیوٹی اور کنگ آرتھر کے قلعے مع دربار اور نائٹ اور ساحرا اور سب متحرک اور گویا جھیلوں کے کنارے گھنے جنگلوں میں اصلی ہاتھی۔ سرکس ٹرین فیرنٹیر لینڈ میں کاؤ بوائے اور "انڈین" اور وائیلڈ ویسٹ کے سموچے قصبے۔ پورا لندن شہر۔ اس کے اوپر اُڑتا پیٹر پین۔ ایک دریا کے دونوں طرف پریوں کے مشہور مغربی کہانیوں کے مناظر موجود تھے۔

دریا پر سے تماشائیوں کی کشتیاں گزر رہی تھیں۔ ٹومارو لینڈ یعنی "کل کی دنیا" میں سائنس کے عجائبات خلا کا "بلیک ہول"۔ پھر مارک ٹوئین کی اسٹیم بوٹ" جو دنیا کے مشہور جنگلوں" میں بہتے" دریاؤں "پر سے گزر رہی تھی۔ ہسپانوی بحری قزاقوں کے جہاز کرسٹفر کولمبس کا جہاز۔ پرانی وضع کی ٹرین نیو اورلینز کے ایک پرانے محل میں مسخرے بھوت ٹام سوائیر کا جزیرہ سولہویں سترہویں میں نئے براعظم اور ملک دریافت کرنے والے یورپینوں کے جہاز مغرب نے پچھلے چار سو سال میں جو زبردست ترقی کی ہے۔ اس کا پورا مرقع ڈزنی لینڈ میں انتہائی دلآویز اور ڈرامائی طریقے سے پیش کر دیا گیا تھا۔

ڈزنی لینڈ کے نیچے مصنوعی سمندر ہے۔ اس کا ایک حصہ جھیل کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔ اس میں ڈبکتی کشتیاں کھڑی تھیں۔ ہر جگہ سیاحوں کی بھیڑ بچے۔ جوان۔ بوڑھے۔ مگر سب خاموش۔ منظم قطاریں۔ شور و غل مفقود۔ ایک ڈبکتی کشتی میں اُتر کر عدنان منصور اور میں دریچوں کے سامنے بیٹھ گئے۔ کشتی تہ آب چلی گئی۔

اب روشن سمندر میں تمام آبی کائنات نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ طرح طرح کی مچھلیاں۔ سمندری پودے۔ جنادری گھونگھے۔ شکستہ بادبانی جہاز ان کے اندر زیوروں اور قیمتی ظروف سے بھرے صندوق ہر چیز مصنوعی "سمندر" کا چکر لگا کر

سب مرین اوپر آئی۔

کچھ فاصلے پر رو پہلے قصر اقوام کے گرداگرد ایک ندی بہہ رہی تھی۔ پل پر سے گزر کر سیاحوں کی قطاریں چھوٹی چھوٹی ڈونگیوں میں بیٹھ رہی تھیں۔ میں اور عدنان ایک کشتی میں بیٹھے بنا پتوار اور انجن یہ ڈونگیاں ایک قطار میں نہر پر چلتی اس فینسی محل کے اندر داخل ہوئیں جس کے پھاٹک کے اندر عربی سمیت دنیا کی ہر بڑی زبان میں "امن" لکھا ہوا تھا۔

نہر کے دونوں جانب فرش سے بعید اونچی چھت تک ہر ملک و قوم کے "بچے" یعنی گڑیاں اور گڈے آنکھیں جھپکا جھپکا کر ایک ساتھ انتہائی دلآویز دھن میں گا رہے تھے IT'S A SMALL WORLD بہت سی گڑیاں غیر مرئی طور سے معلق فضا میں ناچ گا رہی تھیں۔ ہر ملک کی گڑیوں کے پیچھے ان کا قومی پس منظر تھا۔ ہندوستان کی نغمہ سرا رقصاں گڑیوں کے پیچھے تاج محل (جس کی سیڑھیوں پر ایک شیر بیٹھا تھا!)

"قصر الاقوام" کے اندر یہ ہزاروں کی تعداد میں متحرک گڑیاں گڈے جانور اور پرندے جو سب پلکیں جھپکا جھپکا کر ایک ساتھ گا رہے تھے۔ انجینئرنگ کا کمال تھا۔ کس قدر پیچیدہ مشینری اس نازک اور وسیع فینسی کو چلانے کے لئے کام کر رہی ہوگی۔ مختلف قوموں کے طرز تعمیر کی محرابوں (چینی، مراقشی وغیرہ وغیرہ)، نیچے بل کھاتی نہر پر سے گزرتی اس انتہائی خوابناک ماحول میں سے نکل کر کشتی محل سے باہر آئی۔ وہ گیت برابر جاری رہا۔ قصر الاقوام ڈزنی لینڈ کا حاصل مشاعرہ تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد میں نے عدنان میاں سے کہا کوئی اور چیز دیکھنے کے بجائے مثلاً JOURNEY INTO INNERSPACE۔ یا "ذرے کے دل کے اندر سفر" یا "خلا کا بلیک ہول"۔ وغیرہ۔ مجھے اس سے قطعی دلچسپی نہیں۔ سائنس سمجھ ہی میں نہیں آتا)۔

ایک بار پھر کشتی میں بیٹھ کر اس رو پہلے نغمے کے اندر سے گزرنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم لوگ

پھر وہاں گئے وہ رقصاں اور نغمہ سرا گھڑیاں گذرے اور وہ گیت ایک ناقابلِ فراموش
خواب تھا جبکہ ایل اے سے دور لونگ بیچ پر دنیا کا سب سے بڑا جہاز کوئین میری ب
کی عظمتِ رفتہ کے ایک دھندلے خواب کی صورت میں کھڑا ہے۔ برطانوی شاہی روایا
نے اہلِ امریکہ کو ہمیشہ مسحور کیا۔ انہوں نے یہ جہاز خرید کر اسے ایک ٹورسٹ اٹریکشن
بنا دیا ہے۔ نیچے بکھنگم پیلس کے سنتریوں کی وردی پہنے امریکن پہرہ دیتے ہیں اور بہ
برطانوی دھنیں بجاتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران کوئین میری ایک فوجی جہاز
دیا گیا تھا۔ ایک کیبن کے باہر لکھا تھا "ونسٹن چرچل یہاں رہے"

ایک دکان میں ایک پنجابی پاکستانی نوجوان اپنے ملک کی گھریلو مصنوعات ف
کر رہا تھا۔ تانبے کے گلدان، پشاوری چپلیں، مخملی واسکٹیں، کرتے۔ وہ نوجوان جن
کے بعد دنیا کا نمائندہ تھا۔

ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلز میں ہالی ووڈ بولوار تمام مشہور فلم اسٹاروں
ناموں سے مزین ٹائیلوں سے بنی سائیڈ واک پر سے گزرتے منصور میاں جینی تھ
دکھلانے لے گئے جس کے فرش کے سیمنٹ میں فلمی اداکاروں کے دستخط اور پنجو
کے نشان ثبت تھے۔ راستے میں ایک آرکیڈ کے نیچے ایک نوجوان چمڑے کی
میں ملبوس، زنجیریں لگائے، کھڑا اطمینان کے ساتھ کسی سے باتیں کر رہا تھا منصورہ
نے کہا۔

"پھوپھی دیکھئے یہ یہاں کے لیدر پیپل LEATHER PEOPLE میں سے ا
ہے!" جس طرح سان فرانسسکو میں زینیا اور منصور العارفین نے وہاں کی یہ
الخلقت مخلوق دکھائی تھی۔ یہ "چمڑا پوش لوگ" "جنت کی چڑیوں" کا گویا ایک ذ
فرقہ تھا۔ ان کے شراب خانے لیدر بار کہلاتے تھے۔ یہ لوگ نزاکت اور انسانیر
کے بجائے اپنی دبنگ، مردانگی کو مشتہر کرتے ہیں۔ اور چمڑے کے کپڑے پہن کر زنجیرو

ور کیل کانٹوں سے لیس ہو کر اونچی بنے گھوما کرتے ہیں۔

منفرد برطانوی طنز نگار ایلیوین واہ نے ۱۹۴۸ء میں کیلی فورنیا کے چند روزہ قیام کے بعد اپنا وہ شاہکار طنزیہ ناول "THE LOVED ONES" اس خطے کی انوکھی رسوم تجہیز و تکفین کے بارے میں لکھا تھا۔ فارسٹ لان کا قبرستان اس ناول کا موضوع تھا۔ سان فرانسسکو میں منصور العارفین نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان نے بڑے اطمینان سے اپنا تعارف کرایا کہ وہ مردوں کا ہیئر ڈریسر ہے (پسماندگان متوفی کا پورا میک اپ ہیئر اسٹائل مینس لفٹ وغیرہ کرواتے ہیں تاکہ آخری دیدار کے وقت متوفی اپنی بہترین حالت میں نظر آئے)

فارسٹ لائن میں مشہور عالم فلمی ستارے اور کروڑ پتی مدفون ہیں۔ پھاٹک پر مکان کے سائز کی ایک مرمریں کتاب کے پچھلے صفحات پر اس انوکھے گورستان کے متعلق عبارت نقش ہے۔ اندر وہی ایولین واہ کے ناول کی سیٹنگ، چوڑی سڑکیں، پر فضا سر سبز ٹیلے، بل کھاتے خیابان، آبشار، چمنستان، جا بجا خوشنما گرجا گھر، سبزے کی سطح پر ننھے ننھے کتبے، درختوں اور گرجاؤں میں بجتی پوشیدہ موسیقی، پرندوں کی مدھم چہکار، بلبل کے ریکارڈ بڈ نغمے۔ پھاٹک کے نزدیک ایک ٹیوڈر عمارت کے اندر دفاتر، مردوں کی بیوٹی پارلر لاشیں حنوط کرنے کا دار العمل شام ہو چکی تھی۔ دفاتر بند تھے۔ گلدستوں اور پھولوں کی روشن دکان میں البتہ ایک لڑکی کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے فوراً ایلوین واہ کے ناول کی ہیروئن کا خیال آیا۔ عجیب بات ہے، ٹیگور کے شانتی نکیتن میں ایک مرتبہ ایک جلسہ کی بھیڑ میں ایک کابلی والا گھومتا پھرتا نظر آگیا تھا جو شاید مقامی سود خور پٹھان تھا

دفاتر سے کچھ فاصلے پر ایک کوشک کے دریچے میں بیٹھی متبسم خاتون نے فارسٹ لان کا مصور نقشہ پیش کیا۔

شام کے چھ بجنے والے۔ ہم لوگ آخری بلکہ اکیلے سیاح تھے۔ سارا فارسٹ لان بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ ایک چڑھائی پر گئے تاکہ "ابدی موسیقی اور ابدی راحت کی وادی" بھی دیکھ لیں، جو نقشے میں اس طرح کے ناموں والی ان گنت جگہوں میں سے ایک تھی۔ سارے قبرستان کو پھر دیکھنا ناممکن تھا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ سناٹے میں ایک سانولا آدمی نچلی سڑک پر بڑبڑاتا ہوا اکیلا چلتا نظر آیا۔ نجانے کون تھا۔ مخبوط الحواس یا بہرہ شکل سے ہندوستانی یا پاکستانی سا معلوم ہوا۔

"اس سے بات کر کے پوچھیں؟" عدنان نے فوراً والنیر کیا۔

"نہیں بھئی۔ کیا پتہ پاگل ہو۔ اب بھاگو یہاں سے"۔ میں نے کہا۔ ہم لوگ واپس آئے۔ دور سیرا مینوا کے سلسلۂ کوہ پہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک رولز رائس دبیز گمبھیرتا سے گزرتی اوپر چلی گئی۔ کیا پتہ کلارک گیبل یا ٹائرن پاور یا لینڈ ڈارنل کا کوئی عزیز یا پرستار پھول چڑھانے آیا ہو۔ ہم لوگ پھاٹک سے باہر نکلے۔ اچانک میری نظر آسمان پر پڑی۔ محرم کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اس جگہ فارسٹ لان کیلی فورنیا میں محرم کا چاند عجیب سا لگا۔ یہ لوگ اس فینٹسی دنیا میں رہنے اور فینٹسی قبرستانوں میں دفن ہونے والے محرم اور اس کی کائنات سے ناواقف ہیں۔ اور واقعہ کربلا کو پہچاننے کے لئے تو تیسری آنکھ چاہیئے۔

ٹیلی وژن پر شروع شروع میں نیوز کاسٹر ایران کو آئی رین کہہ رہے تھے۔ اب انہیں ایران کہنا آ گیا تھا۔ ایک روز منصور میاں کے ایک پاکستانی دوست نے مجھ سے کہا۔ "آج مجھے کالج میں لڑکوں نے ایرانی ایرانی پکار کر بہت تنگ کیا۔ میں نے کہا کہ میں پاکستانی ہوں۔ تو وہ بولے۔ کیری بھی تو مسلمان تو ہو سب مسلمان ظالم ہوتے ہیں اور غیر منطقی اور نیم منطقی اور نیم مجنوں دوسرے دن اسلام آباد کے امریکن سفارتخانے پر [illegible] کی خبر آئی۔ شام کو وہ لڑکا آ کر بولا" آج لوگوں نے پاکستانی پاکستانی کہہ کہہ آوازے کسے

"اب کیا کروں؟"

"کہہ دو تم انڈین ہو" میں بولی۔ دوسرے دن کلکتہ اور حیدرآباد کے امریکن قونصل خانوں پر ہندوستانی مسلمانوں نے دھاوا بولا۔ اب اس لڑکے نے آ کر کہا۔

"اب انڈین بتانا بھی خطرے سے خالی نہیں! اب کیا کروں؟"

دور ڈزنی لینڈ کے اس خوابناک روپہلے محل میں وہ خوبصورت الیکٹرونک گڑیاں بڑی بڑی معصوم آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسلسل وہ دلنشیں گیت گا رہی ہیں۔ IT IS A SMALL WORLD لیکن یہ بساطِ عالم صد افسوس کہ بازیچۂ اطفال ڈزنی لینڈ نہیں۔ کاش کہ ہوتی۔ بچوں کا ایک آرٹسٹ دوست جو شیشے اور چمکیلے ذروں کے موزیک کا منفرد کام تھا۔ میری آمد سے قبل اپارٹمنٹ کے لونگ روم کی دیواروں پر اپنی تصاویر چھپا گیا تھا تاکہ میں ان کو دیکھ کر اس کے ہندوستان جانے کا بندوبست کروں۔ وہ تنترک بدھسٹ نیپالی تبتی دیو مالا کی تصاویر بناتا تھا۔ اور ہندوستان کے سپنے دیکھتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ ساسیلٹو جا کر وہاں کسی پکچر گیلری کے ذریعہ اپنی تصاویر فروخت کرنے کی کوشش کرے اور سان فرانسسکو میں ہندوستانی کونسل جنرل سے مل لے۔ "سچے فن کا کوئی قدر دان نہیں" اس نے آہ بھری۔ وہ ہپی نہیں تھا۔ بالکل نارمل شخص تھا۔ "امریکہ میں واحد انسان اس تکنیک کو استعمال کر رہا ہوں" اس نے بتایا۔ وہ یونیورسٹی سے آرٹ کی ڈگری لے چکا تھا۔ جس روز وہ اپنی تصاویر دیواروں سے اتار کر ان کو ایک چھوٹے ٹرک میں رکھ کر سان فرانسسکو روانہ ہوا۔ مجھے بہت رنج ہوا۔ نیپال اور تبت جائے بغیر وہاں کے اسرار کی تصویریں بنانے والے اس سفید فام امریکن کے اندرونی خواب نجانے کیا ہوں گے۔ اس نے دو تین تصویریں ایرانی فینٹسی کی بھی بنائی تھیں۔ نیپال اور تبت اور ایران! کہ خواب اور حقیقت میں بہت فرق ہے ——

گو سارا امریکہ لوگوں نے اپنے اپنے خواب دیکھتے ہوئے تعمیر کیا تھا لیکن امریکہ

یں کالوں کا مسئلہ باقی ہے۔ لاس اینجلز میں ۶۵ء میں نسلی فساد ہوئے تھے۔ ایک شام ڈاؤن ٹاؤن میں مٹرگشت کرتے ہوئے عدنان میاں نے مجھ سے کہا۔" پھوپھی دیکھ سامنے جو سڑک ہے یہ پورا ایک بلاک کا راستہ بے حد خطرناک ہے۔ اگر رات گئے یہ گزریں تو کالے عموماً چاقو نکال کر پرس چھین لیتے ہیں۔" لیکن ہم تو عین اسی سڑک پر کھڑے ہیں اور اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔" کوئی بات نہیں ہمارے ساتھ نکل چلیئے۔ ڈ کی کیا بات ہے۔" ایک دیوار کے سہارے چند کالے کھڑے تھے۔ جس طرح فلموں میں خطرناک لوگ کھڑے دکھلائے جاتے ہیں۔ ہم ان کے پاس سے گزر گئے۔ انہوں نے کو دیکھا کچھ بولے نہیں۔ بلاک سے نکل کر میری جان میں جان آئی۔ چند روز بعد پھر ہم لوگ اسی راستے سے گزرے۔ اب مجھ میں ہمت آگئی تھی۔" گوروں نے خواہ مخواہ کالوں کو بدنام کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ اپنا پرس مضبوطی سے تھام کر عدنان اور منصور کے ساتھ پھر اس سائیڈ واک پر سے گزری کالوں کا جتھا اسی جگہ پر موجود تھا۔ ان میں سے ایک نے عدنان کو مخاطب کیا۔ میری جان نکل گئی۔ یا الٰہی خیر یا الٰہی خیر۔ عدنان میاں مسکرا ہوئے ان کے پاس گئے۔ انہوں نے سگریٹ مانگا۔ سگریٹ دینے کے بعد وہ لپک کر سے آن ملے۔

" آئندہ ہرگز ہرگز رات برات اس سڑک پر سے نہ گزرنا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "خطرناک شہر ہے۔ تم یہاں رہتے ہو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے۔"

" ہمیں معلوم ہے۔" مطمئن جواب ملا۔

امریکہ میں کالوں کا مسئلہ یقیناً اب بھی موجود ہے۔ جرائم پیشہ زیادہ تر وہی ہیں افلاس زدہ محلوں میں وہی رہتے ہیں۔ بیروزگاروں کا سرکاری وظیفہ زیادہ تر ان ہی کا ملتا ہے۔ گوریوں کے مقابلے میں چھ فیصدی زیادہ تر کالی لڑکیاں بن بیاہی مائیں ہیں۔

بن ۷۸ء میں نومولود بچوں میں ۲۴ فیصد کو بن بیاہی ماؤں نے جنم دیا تھا اور ان میں
۸ فیصد بن بیاہی مائیں کالی تھیں۔ امریکہ میں چار بچوں والا شہری کنبہ جس کی سالانہ
مدنی چھ ہزار سات سو ڈالر یعنی تقریباً چار ہزار روپے ہوا سے BELOW NATIONAL
POVERTY LINE سمجھا جاتا ہے۔ کالوں کی زیادہ تعداد اس بے حد کم آمدنی والے گروہ
سے تعلق رکھتی ہے۔

صرف دس دن یہاں گزار کر یہ جگہ بھی کتنی مانوس معلوم ہو رہی ہے۔ ۱۱۱۹ نارتھ
یمونٹ کی مالکن ایک بدمزاج بوڑھی عورت ہے۔ جوانی میں حسین رہی ہوگی اور کیا
تہ جوانی میں یہ بھی ایکٹرس بننے کے ارادے سے یہاں آئی ہو۔ ایل اے دنیا کی کہانی
یب وغریب ہے مثلاً نکڑ کی دکان پر سیرین بریڈ یعنی نان بیچنے والا لبنانی
ر یا اس کے باپ دادا کن حالات میں یہاں پہنچے ہوں گے؟ امریکہ کے تقریباً
سارے شہروں میں اس کے بھائی بند مڈل ایسٹرن نان بیچنے والے موجود ہیں
بس طرح یونانی اور اطالوی اور البانوی ریسٹوران والے۔ اور اس جگہ بھی سارے
ریکن قصبوں اور محلوں اور شہری مضافات کی طرح وہ ساری چیزیں موجود ہیں۔
یک عالی شان پبلک لائبریری۔ یورپین اور مڈل ایسٹرن ریسٹوران۔ بینک، ہال۔
سوپر مارکیٹیں، مکانوں کے باغوں میں MOTORIZED LAWNMOWER
، سیٹ پر بیٹھی گھاس ٹھیک کرتی بیویاں۔

"ایل۔ اے" تجارت اور کامیابی کا شہر ہے۔ امریکن خواب کی تعبیر؟ کمرسمس
نے والی ہے۔ دوکانوں کی سجاوٹ اور چکا چوند اور گہما گہمی میں اضافہ "مانا کہ یہ
CONSUMER سوسائٹی ہے مگر ہم چیزیں خریدتے خریدتے بھی اکتا چکے ہیں۔"
روز نوعمر منصور میاں نے مجھ سے کہا۔

ایلن گنزبرگ نے اپنی نظم "کیلی فورنیا کی ایک سوپر مارکیٹ" میں لکھا تھا۔

والٹ وِٹ مین! سر میں درد لئے پورے چاند کو تکتا گلیوں میں سے گزرتا میں تمہا
متعلق کیا سوچ رہا ہوں! بھوکا اور تھکا ہارا، اور تصویری پیکروں کی تلاش کرتا
اور تمہاری فہرست سازی کے خواب دیکھتا میں پھلوں کی ایک جگمگاتی سوپر مارکیٹ
میں گیا- سیب- راہداریوں میں شوہروں کی بھیڑ- ٹروپیکل ناشپاتیوں میں بیویاں
ٹماٹروں میں بچے اور تم گارسیا لورکا! تم تربوزوں میں کیا کر رہے تھے؟ میں نے تم
کو بھی دیکھا- بوڑھے لاولد اکیلے- والٹ وِٹ مین! تم ریفریجریٹر کے گوشت اور دوکا
کے ملازم چھوکروں کو تاک رہے تھے- میں نے تم کو ہر ایک سے سوال کرتے سنا- میر
تمہارے پیچھے پیچھے گھوما کیا- ہم گلیاروں میں ٹہلتے رہے- تمام منجمد نعمتوں کا مزا چکھ
اور کیشیئر کے پاس سے نہ گزرے- والٹ وِٹ مین ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا ہم رات
بھر تنہا سڑکوں پر گھومیں گے؟ درختوں کے سائے تاریکی بڑھا دیتے ہیں مکانوں
میں روشنیاں بجھ جائیں گی- ہم دونوں تنہا ہوں گے- محبت کے گمشدہ امریکہ کے
خواب دیکھتے مکانوں کے باغات کی سڑکوں پر کھڑی نیلی کاروں کے سامنے سے
گزرتے اپنے خاموش کاٹج واپس آجائیں گے؟

آہ- پیارے بابا- بزرگ عزیز- ہمت کا سبق سکھانے والے تنہا بڑے میاں
کس قسم کا امریکہ تمہارا تھا- جب شیرون نے اپنی کشتی کھینی کی اور تم ایک دھنواں دھا
ساحل پر اترے اور لیتھ کے سیاہ پانیوں میں کشتی غائب ہوتی دیکھا کئے؟" ———

ایک شام سن سیٹ بولوار پر سے گزرتے ہوئے محرم کا چاند پھر دکھلائی پڑا
دفعتاً خیال آیا جس تاریخ کو ہوسٹن میں ڈاکٹر گیل مینو نے ڈنر رکھا ہے وہ شاید نویں
دسویں کی رات ہوگی- گھر واپس پہنچتے ہی پروگرام دیکھا اور گیل مینو کو ہوسٹن فون
کیں مجھے بالکل خیال نہیں رہا جب تم نے آئیووا سٹی فون کرکے پروگرام بنایا تھا
لیکچر وغیرہ تو ٹھیک ہے مگر ۳۰ نومبر کو نویں یا دسویں تاریخ محرم کی ہوگی اور میں ڈنر

میں شرکت نہ کر سکوں گی۔"

"اب کیا کروں؟" یونیورسٹی آف ٹیکساس آسٹن کے شعبہ انڈین ہسٹری کی پروفیسر گیل مینو کی آواز آئی۔ "مجھے بھی خیال نہیں رہا کہ وہ عاشورہ ہو گا۔ میں نے ایک مہینہ قبل یہ پروگرام طے کیا ہے۔ یونیورسٹی کے سو کے قریب لوگوں کو تم سے ملوانے کے لئے دعوت نامے بھیج چکی ہوں۔ اب تو وہ دعوت ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ مجھے یقین ہے امام حسین رضؓ معاف کر دیں گے۔ تم سفر میں ہو۔ ٹھیک بات ہے نا؟"

"لیکن شب عاشورہ کو ڈنر۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

جلال میاں بولے۔ "پھوپھی۔ ہمارے ایک دوست کے پاس اسلامی اور انگریزی مخلوط کیلنڈر رہے۔ ہم اسے فون کر کے صحیح تاریخ پوچھتے ہیں۔" معلوم ہوا۔ ۳۰ نومبر گیارہ محرم ہو گی۔ میں نے گیل کو دوبارہ فون کیا۔ "شکر ہے" اس نے کہا۔ روانگی سے چند گھنٹے قبل جلال میاں نے گھبرا کر کہا۔ "ارے آپ کو اب تک بیورلی ہلز تو دکھلائی ہی نہیں۔" اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ ہم لوگ گھر سے نکلے۔ بیورلی ہلز کا چکر لگایا۔ منصور میاں کے بشاش فربہ دوست جمال نے کہا۔ "یہ پھاٹک کھلا ہوا ہے۔ اندر چلتے ہیں۔ یہ جارج ہمیلٹن کا مکان ہے۔ کہہ دیں گے غلطی سے آ گئے تھے۔ تفریح رہے گی۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ مگر یہاں کسی فلم اسٹار کے پھاٹک پر پہرہ نہیں جیسا ہمارے ہاں کا شیوہ ہے۔"

(امریکہ میں مکانوں کے گرد احاطے کی دیوار یا جنگلہ نہیں ہوتا کیونکہ آوارہ بکریاں یا گائیں گھاس اور پھول نہیں چریں گی) ہماری اور ان کی نفسیات میں بہت فرق ہے۔ ہمارے ہاں احساس دولت اور اسٹیٹس سمبلز کا شدید غلبہ ہے۔ جو ان کے ہاں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، اگر آپ کے فلم اسٹار اپنے پھاٹکوں پر سنتری نہ کھڑے کریں تو

شاید ان کے پرستار عوام ان کے مکانوں پر حملہ بول دیں۔ یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔"
جلال میاں نے کہا۔

ایک جگہ "بے بی گوڈ بال یوگی گرد جہاراج" کا محل ایستادہ تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں اہلِ مغرب اس قسم کے لوگوں سے کس طرح مسحور ہو جاتے ہیں دہرہ دون کے ایک معمولی راوت گھرانے کے مکان سے بیورلی ہلز کیلی فورنیا کے اس محل تک کا راستہ صرف اس روحانی طور پر مضطرب اور ناآسودہ اور کنفیوزڈ مغرب کے چیلوں کی وجہ سے ہی طے ہوا۔ HOWL کے آگے اور کیا ہے ایلن گنز برگ؟

رات کے ایک بجے گھر واپس پہنچ کر پیکنگ کی۔ ائیرپورٹ جانے کے لئے سب صبح چار بجے اٹھ گئے۔ میں نے ٹیلی ویژن کھولا۔ ہالی ووڈ کے کسی سٹیشن سے پرسس کھمبا ماں کے ارشاداتِ عالیہ سننے کے بجائے میں نے ایک کلیسائی پروگرام لگایا۔ کسی ہسپانوی سروس میں فرشتوں کی ملکہ تقدیس کی جا رہی تھی۔ نیوترا سنورا نیوترا سنورا۔ ہم سب کے لئے دعا کیجئے۔ یہ دنیا بہت رحم کے قابل جگہ ہے۔ میں نے دل میں کہا۔

دریچے کے باہر ہالی ووڈ کی پہاڑیوں پر پو پھٹی۔ اب ان سرخ صحراؤں کا قصد ہے، جہاں کاؤبوائے اور ریڈ انڈین اب بھی بستے ہیں۔

کاؤبوائے اور ریڈ انڈین

ایر کرافٹ جنوبی کیلی فورنیا سے مڑ کر اب جنوب مغربی صحراؤں اور سُرخ پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ ریاست ایری زونا کے شہر توسُون کا ایرپورٹ کچھ کچھ چک لالہ (راولپنڈی) ایرپورٹ معلوم ہوا۔ امریکن طیران گاہوں کے عام معیار سے بہت مختصر۔ ہوائی جہاز ایر جیٹی کی سقف گیلری سے جا لگنے کے بجائے میدان میں رک گیا۔ سامنے کے دروازے میں بی بی لنڈا اونٹنگ کھڑی نظر آئیں۔ ان کے پیچھے مشہور اینڈرولوجسٹ ڈاکٹر مائیکل جہار۔ ریاست اری زونا اپنے صحرائی حسن کی وجہ سے PAINTED PESERT کہلاتی ہے اور ہسپانوی میکسیکن تہذیب کی چھاپ۔ دیو ہیکل کیکٹس۔ چاروں طرف خشک پہاڑ۔ شدید گرمی۔ یونیورسٹی کے یونیٹیرین سنٹر کے مہمان خانے میں چہار دیواری والا عقبی صحن۔ عرب اندلسی مکانوں کی صدیوں پار سے آئی ہوئی آواز بازگشت۔

کھانے والے کمرے کی دیوار پر سوویت یونین کا یوجینی یونیٹنسکو ایک پوری نظم انگریزی میں لکھ گیا تھا۔ باورچی خانے کے دریچے کے باہر زرد پھولوں والا گھنا درخت۔

شام کو یونیورسٹی پولیس کی خاتون افسر نے آکر خیریت دریافت کی۔

صحرائی راتوں میں وسعت اور تاریکی اور سناٹے کا احساس زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے صحرا کی ان تنہا رویوں یعنی گلہ بانوں نے جو کاؤبوائے کہلائے۔ اپنی

خیمہ گاہوں اور چوبی کاٹجوں کے سامنے یا الاؤ کے گرد سیاہ آسمان کے نیچے بیٹھ کر گٹار بجاتے ہوئے وہ نغمے تخلیق کرے۔

اس اندھیری رات میں کیمپس سے بہت فاصلے پر ہندی پروفیسر انوپ چینڈولا کے رولا کے روشن مکان میں اگر استعارے کو آگے لے جایا جائے تو یوں کہیئے کہ میدان علم کے نئے کاؤبوائے جمع تھے۔ اور کاؤ گرلز ڈاکٹر لنزی نلیمنگ ڈ آگ کا دریا پر جن کا طویل مقالہ جنرل آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز میں شائع ہوا تھا۔ ایک پاکستانی پنجابی نوجوان ڈاکٹر ریاض جو یونیورسٹی کے عربی فارسی مخطوطات کے نگراں تھے اور بہت سے امریکن پروفیسر اور پروفیسرنیاں جن کو ڈاکٹر اور مسز چینڈولا نے راقم الحروف سے ملوانے کے لئے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مع ایولین اور رابرٹ وردی جو بسلسلۂ ریسرچ لکھنؤ میں رہ چکے تھے۔

ذرا ایک منٹ ٹھہرے۔ مغرب کے ذخائر علوم وفنون شرقیہ۔ پوری انڈیا آفس لائبریری سارا برٹش میوزیم ہندوستان کے تمام کتب خانے۔ ہندوستان کے ایک سائیکل رکشا کھینچنے والے کیلئے بے معنی ہیں۔ کیونکہ اس کی کچھ مدد نہیں کرتے۔ کسی بھی مغربی کیمپس پر جا کر کبھی کسی کو یہ خیال آتا ہے کہ مثلاً علی گڑھ یا لکھنؤ، الہ آباد یا ڈھاکہ یا اور کوئی یونیورسٹی ٹاؤن ہندوستان اور بنگلہ دیش میں ایسی جگہیں ہیں جہاں ہزار نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے ہم قوم مفلوک الحال مدقوق نوجوان یا بوڑھے چلچلاتی دھوپ اور لو یا کڑکڑاتے جاڑے یا برسات میں سائیکل رکشا کھینچتے ان طلباء اور ان کے استادوں کو یونیورسٹی لاتے لے جاتے ہیں۔

اب میں ڈاکٹر چینڈولا کے ڈرائنگ روم آپ کو واپس لئے چلتی ہوں۔ موصوف بہت ہی خلیق اور بھلے آدمی تھے۔ گڑھوال کے باشندے۔ یہاں اٹھارہ سال سے پڑھا رہے تھے۔ ان کی بیوی بھی بہت ملنسار اور نیک خاتون تھیں۔ ہندی گیتوں

یں دیوی کے تصور پر ڈاکٹریٹ کر چکی تھیں۔

شکتی کے تصور کی تجسیم مختلف ہے۔ بنیادی تصور یکساں ہے اور علامہ اقبال کو تو دیو استبداد اور جمہوریت کی نیلم پری دونوں ایک سے معلوم ہوئے تھے۔

دوسرے روز اسکول آف جرنلزم کے صدر شعبہ ڈاکٹر فورڈ کی ایک کلاس میں راقم الحروف نے انڈین جرنلزم پر لیکچر دیتے ہوئے ڈاک ہرکاروں کے ذریعے سرکاری خبر رسانی درباری وقائع نویسی کا تذکرہ کیا جو سامعین کے لئے بالکل غیر متوقع چیز تھی، کیونکہ وہ ہندوستان کے اٹھارھویں صدی سے شروع ہونے والے چھاپے خانوں اور اخباروں کے متعلق بھی کچھ نہ جانتے تھے۔

ایک دلچسپ بات ہے۔ عہد وسطیٰ میں عرب کاغذ سازی نے اسلامی تہذیب دنیا میں پھیلائی تھی۔ پندرھویں صدی یوروپ میں چھاپے کی ایجاد کے کچھ عرصے بعد مارٹن لوتھر کی اصلاح دین کی کامیاب اشاعت ہو سکی۔ آج کے ایران میں آیت اللہ خمینی کی تقریروں کے کیسٹ شاہ کی شہنشاہیت کے آخری دنوں میں ایران میں گھر گھر بجائے گئے تھے۔ اس روز دور دراز طہران میں امریکن یرغمالیوں کی قید کا شاید تیئیسواں دن تھا۔ لیکچر کے دوران ایک لڑکا ٹیلی پرنٹر کا کاغذی فیتہ لالا کر میز پر رکھتا جا رہا تھا۔ اس پر چھپی ہر ایران کے متعلق ہر خبر کے آخر میں دو الفاظ درج تھے — SLUG KHOMEINI اس پیمانے کے قومی غم وغصے اور تنفر کا اظہار پچھلی جنگِ عظیم میں جرمنوں کے خلاف ہی کیا گیا تھا۔

تیسرے روز پروفیسر فورڈ نے بے حد تعجب سے بار بار پوچھا "آج انہوں نے چند امریکن عورتوں کو رہا کر دیا ہے۔ عورتوں کو کیوں رہا کیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

"بہت ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ شیعہ اسلام میں فاطمہؓ بنت رسولؐ خاص اہمیت کی مالک ہیں۔ علاوہ ازیں شیعہ مذہبی قانونِ وراثت وغیرہ بھی عورتوں

کے لئے زیادہ منصفانہ ہے۔ ممکن ہے اسی لئے یہ ایرانی علماء عورتوں کو کچھ اہمیت دیتے ہوں مگر چند ماہ بعد ماہر تعلیم خانم پارسا کو گولی سے اڑا دیا گیا۔)

اس صبح (ADVANCED JOURNALISM) کی کلاس میں میں نے ایرانی تاریخ میں شاہ اور ملاکی آویزش، شیعہ اسلام میں امامت کے تصور وغیرہ کے متعلق ایسے طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کی جو مسئلہ خلافت و امامت تو خیر بہت آگے کی بات ہے۔ اسلام ہی سے قطعاً ناواقف تھے۔

ڈاکٹر فورڈ نے بعد میں اس کلاس سے کہا کہ اس لیکچر پر مبنی ایک اسٹوری ایران پر تیار کرے۔ (ہر امریکن یونیورسٹی کے مدرسہ صحافت کی طرح اس اسکول آف جرنلزم کا بھی اپنا ضخیم روزانہ اخبار تھا جسے طلبا شائع کرتے تھے۔)

تیسرے پہر کو میں ڈاکٹر مائیکل جہار کے ساتھ لفٹ میں اوپر جا رہی تھی۔ ایک فلور پر ایک صاحب پھرتی سے داخل ہوئے "میں ابھی واشنگٹن سے واپس آرہا ہوں۔ بھاگا بھاگا گیا تھا کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ والوں کو ایران کے متعلق کچھ سمجھاؤں میں نے بچشم خود تہران میں شاہ کے مخالف مظاہرین کو گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا ہے اور ان کو مارنے والے فوجی امریکن اسلحہ جات سے لیس ہوتے تھے۔ امریکہ سے اس شدید تنفر کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مگر وہاں کسی نے میری نہیں سنی"! اتنا کہہ کر وہ صاحب ایک فلور پر اسی سرعت کے ساتھ لفٹ سے نکل گئے۔

یہ صدر شعبہ فارسی تھے۔ ڈاکٹر جہار نے بتایا شام کو شعبہ علوم شرقیہ میں "وزٹنگ انڈین موزیم جرنلسٹ" کے لئے پارٹی کے دوران فارسی ادبیات کے وہ خوش رفتار و خوش گفتار امریکن پروفیسر پھر ملے۔ فارسی ایرانی لب و لہجے میں بولتے تھے۔ دو سال ایران میں رہ چکے تھے۔ پارٹی کے دوران ایک مصری پروفیسر سے میں نے دریافت کیا۔ مصر میں قبطیوں کو کیا بہت تنگ کیا جاتا ہے؟"

" نہیں۔ مگر وہ امریکہ آکر یہی کہتے ہیں تاکہ اپنے ہم مذہب عیسائی امریکنوں کی ہمدردی حاصل کریں۔ اور گرین کارڈ مل جائے۔" انہوں نے جواب دیا۔
یہ بات بھی مجھے سو فیصدی صحیح معلوم نہیں ہوئی۔ کیونکہ اسلامی انتہا پسند مصر میں آج کل قبطی گرجا پر حملے کر رہے ہیں۔
دکھی دنیا کے ان ہولناک مسائل سے بے نیاز کیمپس پر ایک جگہ گھاس پر بیٹھے ہرے کرشنا والے امریکن چھوکرے کیرتن گا رہے تھے۔ ایک لڑکا ہارمونیم بجا رہا تھا۔ ایک ڈھول ان کے لٹریچر کی کتابوں کا انبار سامنے رکھا تھا اور ایک ـ
"JESUS FREK" نوجوان ایک سر منڈے امریکن سنیاسی کی ناک کے نیچے بائبل ٹھونس کر مناظرے میں مصروف تھا۔ بے حد دلچسپ بحث جاری تھی۔ ہندو یوگیوں کے پھیلائے ہوئے CULTS کے ردِ عمل کے طور پر نوجوانوں میں چند عیسائی فرقے بھی نمودار ہو چکے ہیں۔ "JESUS FREAKS" ان میں سے ایک گروہ ہے۔
ایک ساڑی پوش خاتون کو قریب سے گزرتا دیکھ کر سنیاسیوں نے بڑی خوشی سے "ہرے کرشنا!" کا نعرہ لگایا۔ میں نے نہایت متانت سے اس کا جواب دیا۔ شِوا شِوا۔ اور آگے بڑھ گئی۔ ان کے چہرے اُتر گئے۔ اور وہ پھر اپنے ڈھول مجیرے اور مناظرے کی طرف متوجہ ہوئے۔
" ہرے کرشنا والے امریکنوں کے سامنے شِوا کا نام لو تو بہت خفا ہوتے ہیں۔" میں نے لِنڈا سے کہا۔ "مکمل مفاہمت دیوتاؤں میں بھی نہیں ہے۔ تو قبطیوں اور مسلمانوں اور ایرانیوں اور امریکنوں اور عربوں اور اسرائیلیوں میں کیسے ہو گی۔"
ایرپورٹ سے شہر جاتے ہوئے میں نے پروفیسر بہار سے کہا تھا کہ در مونٹ کے گھنے رنگ برنگے جنگلوں اور کوہساروں کے بعد یہ صحرا کس قدر مختلف ہے۔" کیا تم کو مشرقی ساحل کی کسی یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا؟"

"پن سلوینیا اور شمال میں منی سوٹا نے وہاں گئی نہیں۔ وقت نہیں ملا۔ ورمونٹ میرے کزن نے بلایا تھا۔ ایر ٹکٹ بھیج دیا تھا۔"

پروفیسر مائیکل جہان نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ دوسرے روز اپنی کھچا کھچ بھری عمرانیات کی کلاس میں تعارف کراتے ہوئے فرمایا جب یہ بمبئی سے آیووا سٹی پہنچیں تو آیووا سٹی سے برلنگٹن تک جانے کا ایر ٹکٹ پہلے سے ان کا منتظر تھا جو ان کے کزن نے کینیڈا سے بھیجا تھا۔ یہ یگانگت اس معاشرے کی خصوصیت ہے۔ جس میں EXTENDED خاندان کو اصل خاندان میں شامل سمجھا جاتا ہے۔"

"آپ کو یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوئی لیکن ہم لوگوں کو آپ کا معاشرہ عجیب لگتا ہے جس میں "اصل" خاندان اور XTENED خاندان میں فرق کیا جاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

مغرب میں رشتہ داروں کی اجنبیت ہم لوگوں کو ہمیشہ متحیر کرتی ہے۔ میں مغربی جرمنی میں ایک ایسے میاں بیوی کو جانتی ہوں۔ میاں ہندوستانی ہیں۔ بیوی جرمن۔ جب کبھی وہ لڑکی اپنی ماں کو اپنے بچے کے چند گھنٹے کی "بے بی سٹنگ" کے لئے بلاتی تھی بطور معاوضہ ماں کے لئے قیمتی تحائف رکھ جاتی۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں نانیاں دادیاں خود تحائف لاکر بے تکان بے بی سٹنگ کرتی ہیں۔"

"اسی لئے جوائنٹ فیملی کے متعلق کچھ بتاؤ۔" ڈاکٹر جہار بولے۔

"جوائنٹ فیملی اور کاسٹ سسٹم وغیرہ پر آپ خود کافی لیکچر دے چکے ہوں گے لیکن میرے خیال میں آپ کے شاگرد یہ بالکل نہیں جانتے کہ یہ زندگی کس قسم کے مکانوں میں گزاری جاتی تھی۔" میں نے بلیک بورڈ پر ایک روائتی انڈو مسلم "مردانہ" اور "زنانہ" مکان کا نقشہ بنایا۔ دالان۔ در دالان کے اندر ایک قطار میں بچھے پلنگ۔ صحنچیاں۔ آنگن۔ مشرق کی گھریلو اجتماعی زندگی میں فرد PRIVACY کا تصور تقریباً مفقود تھا۔

مرزا ابوطالب اصفہانی جو کلکتے سے ۱۷۹۹ء میں ڈبلن گئے تھے۔ انہوں نے ایک آئرش مکان میں قیام کر کے حیرت کے ساتھ قلمبند کیا تھا کہ ان لوگوں کے ہاں ہر کام کے لئے الگ الگ کمرے ہیں۔ کھانے کا کمرہ الگ۔ سونے کا الگ۔ بیٹھک الگ۔ اور باورچی خانے میں قیمہ اور پیاز کاٹنے کے لئے آہنی مشینیں اور برصغیر ہند و پاکستان و بنگلہ دیش کے روائتی مکانات آج بھی اسی طرح کے ہیں جیسے مرزا ابوطالب کے زمانے میں تھے اور جو تعجب مرزا ابوطالب کو آج سے پونے دو سو سال قبل انفرادیت پرست مغرب میں پہنچ کر ہوا تھا۔ اسی تعجب سے امریکن طلبہ مشرقی طرز زندگی کے متعلق سن رہے تھے۔ مغرب میں آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں بھی بغیر اطلاع یا بن بلائے بلا اجازت اچانک نہیں پہنچ سکتے لیکن اسی وجہ سے آپ کو ماہرین نفسیات اور سوامیوں سے اپوائنٹمنٹ لینے پڑتے ہیں۔ میں نے کہا۔

شام کو یونیورسٹی کے ایک آڈیٹوریم میں "اسلام میں عورتوں کا درجہ" پر لیکچر دیتے ہوئے محسوس ہوا کہ سامعین کے لئے اسلام بھی ایک دوسرے کُرّے کی چیز تھی۔ یہ موضوع اس وقت ڈاکٹر فورڈ اور ڈاکٹر فلیمنگ نے اسلامی ممالک میں انتہا پسند تجدیدیت کی لہر کے مدنظر تجویز کیا تھا۔ "جرم"۔ "چار شادیاں" "پردہ مسلم عورتوں کی کمتر حیثیت" وغیرہ عام تصورات اور سعودی عرب اور ایران کے موجودہ حالات کے مناظر میں ایک پیچیدہ اور نازک موضوع تھا۔ اسلام میں حقوقِ نسواں اور اسلامی تاریخ میں عورتوں کے اہم رول وغیرہ کے متعلق بے حد وضاحتی اور تقریباً تبلیغی لیکچر کے بعد حسبِ معمول آیت اللہ خمینی کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ۔ آپ کہتی ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو یہ سب حقوق دیئے ہیں۔ مگر ملا خمینی نے تو پردے کا حکم صادر کیا ہے۔ آپ کہتی ہیں اس روائتی پردے کا قرآن میں ذکر نہیں

ہے۔ ورنہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کھلے منہ حج کرنے کا حکم نہ ہوتا۔ اور آپ نے کہا اسلام میں چرچ اور CLERGY نہیں ہے۔ تو پھر یہ ایران کے آیت اللہ لوگ کون ہیں؟" امریکیوں نے سوال کیا۔

سامعین میں ایک نہایت جوشیلے پاکستانی مسلمان بھی موجود تھے۔ انہوں نے میری تقریر پر نہایت کٹر ملاپن کے اعتراضات لئے۔

جس وقت میں نے کہا۔ مغربی عورتوں کو شوہر سے علیحدہ اپنی جائداد رکھنے کا حق اب جاکر ملا ہے۔ قرآن نے یہ حق چودہ سو برس قبل دیا تھا وغیرہ۔ اس وقت سامعین میں ایک امریکن لڑکی "بالکل ٹھیک"۔ "بالکل درست" کہے جارہی تھی۔ شہر ٹوسون کے روزنامے کے دو رپورٹر اگلی صف میں بیٹھے تھے۔ ان کے سوالات سے نپٹنے کے بعد ہال سے باہر نکلنے لگی تو وہ لڑکی سامنے آئی اور مصافحے کے بعد گرمجوشی سے بولی "السلام علیکم"! میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ قطعی شرعی لباس۔ پیشانی تک اسکارف۔ لمبی آستین۔ ٹخنوں تک لمبا فراک۔ "مرحبا۔ اسلام آجکل اتنا بدنام ہورہا ہے۔ آپ نے اس کی صحیح صورت پیش کی۔" اس شرعی امریکن لڑکی نے کہا۔

"کیا تم اسلامی تاریخ کی طالب علم ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"الحمد اللہ کہ میں خود مسلمان ہوں۔ وہابی مسلمان۔"

لیجئے صاحب۔ اب تک امریکن "ہندو" صافے اور کرپانیں باندھے امریکی "سکھ" لڑکے لڑکیاں نظر آتے تھے۔ اب تبلیغی جماعت کی کوشش سے اکا دکا طالب مسلمان بھی ہونے لگے۔ اور وہ بھی FUNDAMENTALIST۔ کیونکہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے والوں کو اس مذہب کا انتہا پسند روپ ہی بھاتا ہے۔ ہرے کرشنا والے مغربی لوگ ہندوستان کے پیدائشی سناتن دھرم ہندوؤں سے کہیں زیادہ کٹر ہیں یہ CONVERT کی نفسیات ہے۔

وسری صبح شہر کے اخبارات میں مفصل دو کالم کی رپورٹیں چھپیں" موزلم جرنلسٹ
"۔ ایران کی صورت حال کے متعلق موزلم جرنلسٹ کا خیال ہے کہ یہ ایران
کار روائی ہے کیونکہ سی آئی اے کی مدد سے شاہ ـــــ وغیرہ وغیرہ اور یہ
چاہیئے کہ ایران کا یہ مطالبہ کہ شاہ کے جرائم کی تحقیقات کی جائے منظور
وغیرہ وغیرہ لفظ" انڈین" وہاں عموماً" ان قبائل کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جن
انڈین کہتے ہیں۔

است اریزونا نواہو اور ہوپی انڈین قبائل کا وطن ہے۔ کیلی فورنیا کے
زونا اور ٹیکس بھی میکسیکو نے جنگ میں ہار کر امریکہ کو دے دیئے تھے لیکن
مدوستانی" قبائل سے گورے مہاجروں کی لڑائیاں جاری رہیں۔ اپاش قبیلے سے
جنگ ۱۸۸۶ء میں جیتی گئی تھی۔ گایوں کے ریوڑ پالنے والے RANCHERS نے
فاظت کے لئے کاؤ بوائے نوکر رکھے۔ امریکن رومانس کی تخلیق، سرخ ہندوستانیوں
کے علاوہ خود بھیڑ پالنے والوں، گائے پالنے والوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں۔
ائے رومانس۔

ئی ریڈ انڈین بستی دکھلایئے"۔ میں نے پروفیسر مہار سے کہا۔

روز بڑی دھوپ پڑ رہی تھی۔ ایولین وردی اور رلنڈا کے ساتھ ڈاکٹر مہار کی کار
طرف جاتے ہوئے راستے میں سُرخ مرچیں نظر آئیں۔ جو دھوپ میں سکھائی
مرچیں میکسیکن کھانوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔

یکو کی سرحد پار کر کے ہر سال تقریباً" تیس لاکھ میکسیکن اور باقی جنوبی امریکہ
قانونی طور پر براہ ٹیکسس امریکہ میں داخل ہوتے ہیں۔ پریشان حال تیسری
کی سرحد سے شروع ہو جاتی ہے لیکن خود امریکہ کے اندر ہر شخص مصروف عیش

چند خستہ حال مکان دکھائی دیئے جن کے سامنے کھٹارا کاریں کھڑی تھیں۔ چند ریڈ انڈین ان کھٹارا کاروں کے انجنوں پر چڑھے کاہلی سے تمباکو پی رہے تھے۔ کچھ بہت ہندوستانی سا منظر تھا۔ سستی اور بے پرواہی۔

"چراغ تلے اندھیرا" میں نے اظہار خیال کیا۔

"یہ لوگ کاہل ہیں اور اپنا طرز زندگی بدلنا نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر جہاں نے کہا۔" لیکن اب پچھلے دس سال سے ان کے ہاں بھی سیاسی شعور پیدا ہو چلا۔"

"کمال ہے۔ کالوں نے لڑ بھڑ کر، دکھ اٹھا کر، قربانیاں دے کر امریکن کلچر پر اپنا اہم مقام حاصل کر لیا۔ موسیقی۔ ادب، تعلیم، سیاست ہر جگہ۔ مگر ملک کے یہ باشندے اور ان کا یہ حال، ان کی اپنی یونیورسٹیاں اور اپنی موسیقی اور اپنے اخبار ہونے چاہئیں تھے۔ آخر وجہ کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ "بہت سے انڈین ملک کی سفید فام آبادی میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت کھو چکے ہیں۔ ا ان کی اکثریت پس ماندہ رہ کر اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

بستی کا انڈین کمیونٹی سینٹر سنسان پڑا تھا۔ احاطے کی دیوار پر ایک انڈین لڑکا بڑی چابکدستی سے ایک قبائلی رقص کا فرسکو بنانے میں مصروف تھا۔ سوالات کا مختصر جواب دیتا رہا۔ نا مسکرایا نہ خود سے کوئی بات کی۔ سینٹر سے نکل ہم لوگ شاہراہ کے کنارے ایک میکزیکن ریسٹوران میں گئے۔ میکزیکن انڈین النسل لوگ سرخی مائل رنگت، کھڑا نقشہ۔ کچھ کچھ ہریانہ کے جاٹ سے معلوم ہو تھے۔ (ریڈ انڈین۔ قبائل دراصل منگولین لوگ تھے۔ جو ہزار سال قبل آبنائے بیر عبور کر کے سائبیریا سے امریکہ پہنچے تھے۔) سولہویں صدی عیسوی میں ہسپانو پرتگالی فاتحین نے مایا اور ازٹیک وغیرہ پوری تہذیبیں اجاڑ ڈالیں۔ مگر جب باقی

انڈین) رومن کیتھولک ہو گئے تو ہر جگہ اور جنوبی امریکہ اور ادھر گوا اور فلپائن میں مقامی
لوگوں سے شادی بیاہ کرتے رہے۔ انگریز اور دوسرے شمالی یورپین اور پروٹسٹنٹ
فاتحین کے برعکس ان لوگوں میں نسلی تعصب نہیں تھا اور میرے خیال میں یہ ان کے
اندلسی عرب ورثے کا لاشعوری اثر تھا۔ یعنی یہ کہ جب مفتوح ذمی یا کافر نے اسلام
قبول کیا تو بلا تخصیص رنگ و نسل امت میں شامل کر لیا گیا۔

سیاہ چشم میکسیکن ویٹرس نے مرچوں والا کھانا پیش کیا۔ ایک ریڈ انڈین لڑکی
اپنا قومی لباس پہنے بال میں ایک پر لگائے ریسٹوران سے نکلی اور اپنی کار ڈرائیو
کرتی روانہ ہو گئی۔

اور آگے ریگستان کے وسط میں ایک سفید رنگ کا ہسپانوی کیتھڈرل تیز نیلے
آسمان کے مقابل میں ایستادہ تھا۔ سامنے دیو قامت کیکٹس۔ اندر مذہبی تصاویر
اور شمعوں کے ہجوم میں ایک حنوط شدہ نوجوان راہب شیشے کے تابوت میں خوابیدہ
تھا۔ اس کے سیاہ لبادے پر پنوں کے ذریعے بے شمار تصاویر ٹانک دی گئی تھیں۔
زیادہ تر تصویریں نوجوان فوجی سپاہیوں کی تھیں۔ جو ان کی ماؤں نے ان کی
منتیں مان کر اس مقدس پادری کے کفن پہ ٹانک دی تھیں۔

جب ہم لوگ ٹوسون واپس آ رہے تھے وہ ریڈ انڈین اسی طرح اپنی کاروں
کے انجنوں پر چپ چاپ بیٹھے تمباکو پیتے نظر آئے۔ کالوں کی مانند یہ لوگ احتجاج
کیوں نہیں کرتے؟

"اب ایک کاؤبوائے سٹور بھی دیکھتی چلو شاید وہاں کاؤبوائے بھی نظر آ جائے۔"
مسٹر مہاربن نے شہر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اس دکان میں گھوڑوں کی مرصع زین چمڑے کے ملبوسات۔ ٹوپیاں۔ ایڑی
والے مرصع جوتے۔ مرصع پیٹیاں کٹار۔ غرضیکہ پورا کاؤبوائے ساز و سامان بک رہا تھا۔

برآمدے کے باہر گھوڑا باندھنے کی کھونٹیں بھی موجود تھیں۔ جب گلہ بانی
اور راڈر اور IPEMOTE CONTROL سے شروع ہو گی۔ کاؤبوائے بھی
ہوجائیں گے۔

رات کو لنڈا کے ہاں دعوت میں ان کے ماہر موسمیات شوہر نے
نفیس کھانا تیار کیا تھا۔ معہ مرچوں والی میکسیکن مسور کی دال، باقی مہمان
ایک ڈش ساتھ لائے تھے۔ ڈاکٹر ریاض کے بیوی بچے چند روز بعد ا
جانے والے تھے۔ ڈاکٹر اور مسز چیڈولہ کچھ عرصہ قبل ہندوستان
تھے۔ وہی معاملہ یہاں ہر طرح کی آسائش تھی۔ مگر دل وطن میں اٹکا
لنڈا کے اونچی چھتوں والے بنگلے میں برطانوی ہند کی چھاؤنیوں
بنگلوں کی جھلک موجود تھی۔ دشتِ اری زونا کے پرانے کیمپ ماحو
گرم موسم نے یہ اسٹائل تخلیق کیا ہوگا۔

لنڈا اردو جدیدیوں کے بارے میں مقالہ لکھنے میں مصروف تھی۔" یاد
اگر تمہارے بجائے تیسری دنیا کی کوئی لڑکی، الجیرین، یا تھائی لینڈ یا انڈ
یا کوئی کالی امریکن ہی یہ مقالہ لکھنے ہندوستان و پاکستان آئی۔ اردو حلقو
اسے اس قدر اہمیت نہ دی جاتی لیکن تم سفید فام ہو۔ اور امریکن ہو ہم
COLONIAL HANGOVER ابھی زائل نہیں ہوا ہے۔" میں نے اس
ایک مرتبہ رالف رسل نے مجھ سے اظہارِ خیال کیا تھا کہ لوگ ان کو اس لئے
قابلِ ذکر سمجھتے ہیں کہ ایک انگریز اردو پڑھتا پڑھاتا ہے۔

اور اب دس گیلن دزنی ہیٹ پہننے تیل کے کروڑپتیوں کے دیس "۔
جارہی ہوں۔

تنہا ستارہ

ساری دنیا کے بچے اور قبل از بلوغ سطح کے ذہن کے لوگ ہالی ووڈ کے HORSE OPERAY پر عاشق ہیں۔ امریکن "وائیلڈ ویسٹ" کے یہ کردار سر شہسوار دستے یعنی RANGERS شیرف۔ بہادر اور نیک دل اور اصول پرست کاؤبوائے بدطینت اور بے رحم آؤٹ لا اور مجرم اور ڈاکو یہ گویا ایک MORALITY — PLAY MODERN — کے علامتی کردار تھے۔ مجھے ایک اندوہناک کاؤبوائے گیت یاد آیا۔

امپرنیٹ کے زمانۂ ادارت میں بعنوان GUN IS AGUN IS A GUN وابرٹ کینیڈی کے قتل کے بعد امریکہ میں بندوقوں اور پستولوں کی فراوانی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ (صدر کینیڈی بھی ٹیکسس کے شہر ڈیلاس میں مارے گئے تھے)۔ تو اس کاؤبوائے گیت سے میں نے وہ مضمون امپرنیٹ میں شروع کیا تھا۔ اور وہ گیت یوں تھا۔

"صبح منہ اندھیرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر RANCG پر گیا وہاں مجھے سفید لینن میں ملبوس کوئلے جیسی سیاہ آنکھوں اور لہراتے بالوں والا ایک نوعمر کاؤبوائے دکھائی پڑا۔ اپنے دوست اور عزیز میں بوسٹن میں چھوڑ آیا۔ میرے ماں باپ کو پتہ

نہیں ہیں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں پہلے ٹیکسس گیا اور ایک RANGG پر نوکری کرلی۔ میرے سینے پر گولی آن لگی اور موت میرا مقدر ہے۔"

پروفیسر آرنلڈ ٹوئینبی کا کہنا ہے۔" شمالی امریکن کاؤ بوائے، جنوبی امریکن GAUCGOS (امریکن، یوریپین، ریڈ انڈین۔ مخلوط النسل، شہسوار گلے بان) اور آسٹریلیا کے ریور ہانکنے والوں نے ازمنہ رفتہ کے سیتھین، تاتاری اور عرب شہسواروں کی طرح دنیا کو مسحور کیا۔ امریکن اور آسٹریلین STEPPES (وسیع چراگاہوں کی امکانی قوت اتنی زیر دست تھی کہ انہوں نے زرعی اور صنعتی تمدن کے پروردہ لوگوں کو کم از کم ایک نسل کے لئے خانہ بدوشوں میں تبدیل کر دیا جبکہ ان خطوں کے اصل باشندوں نے گلہ بانی کی بجائے محض۔ PASTORALPRE سطح پر شکار کر کے جانور مارنے اور کھانے کے طرزِ زندگی پر اکتفا کیا۔ اور اس سے آگے ترقی نہ کی۔

ٹیکسس LONE STAR STATE کہلاتی ہے اور LOWE RANGER اس کا ایک رومانی شہسوار کردار ہے۔

چنانچہ ٹیکسس پہنچ کر آپ ہوپ ایلونگ کیسڈی اور رائے روجرز وغیرہم کے پسِ منظر کی جھلکیاں دیکھنے کی امید تو رکھ سکتے ہیں لیکن محمدی بیگم مرحومہ اڈیٹر تہذیب نسواں کی حیات ان کی بہن کی ہاتھ کی ایک کاپی یک پر لکھی ذرا غیر متوقع چیز ہے۔

جب ڈاکٹر گیسل مینو نے مجھے آیو داسٹی فون کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ ہندوستا[ن] مسلم عورتوں کی اولین تعلیمی تحریک پر کام کر رہی ہے اور اس سلسلے میں محمدی بیگم عبداللہ بیگم، نذر سجاد حیدر، وغیرہ پر کافی ریسرچ کر چکی ہے۔ گیلی کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر ملنسار اور دلچسپ لڑکی ہے۔ بالفاظِ دیگر چنڈو خانے کی ایک رکن۔ (اس رکنیت کو آپ محض اپنی چھٹی حس کے ذریعے ہی پہچان سکتے ہیں)

ٹوسون سے تین گھنٹے کی پرواز کے بعد ٹیکسس کا شہر آسٹن جس کے ایرپورٹ

پر منتظر گیل مینو ویسی ہی نکلی جیسی توقع تھی۔

گیل یونیورسٹی آف ٹیکسس ایٹ آسٹن میں انڈین ہسٹری پڑھاتی تھی۔ اور علی برادران اور خلافتِ تحریک پر اس کی کتاب نیویارک سے چھپنے والی تھی۔ (اب شائع ہو چکی ہے)

اری زونا بھُن رہا تھا۔ یہاں شدید سردی تھی۔ آسٹن خوبصورت شہر تھا۔ موسمِ خزاں کے زرد عنابی درختوں سے معمور کیمپس کے نزدیک ایک خیاباں کے کنارے جو لارل لین کہلاتا تھا۔ گیل کا مکان سنہرے درختوں میں پوشیدہ تھا۔ دوسری منزل پر مہمان کمرے کی دیواروں پر ایک انگریز نما بزرگ کی تصویریں آویزاں تھیں۔

"ہاں۔ بوب کے دادا انگریز تھے۔ امریکہ آ گئے تھے۔ میں خود فرانسیسی نژاد ہوں۔ بوب یونیورسٹی میں امریکن ہسٹری پڑھاتا ہے۔"

گیل چار سال لکھنؤ میں رہ چکی تھی جہاں اس کا پہلا شوہر بسلسلہ CARE تعینات تھا۔ اس کا خورد سال بچہ ٹام لکھنؤ میں خدا کو پیارا ہوا تھا۔ اور وہ پلٹتے ہوئے ایک بچی متبنیٰ کر لائی تھی۔ اس کا نام لیلیٰ رکھا تھا اور اسے شہزادیوں کی طرح پال رہی تھی۔ میں نے شروع شروع میں اس سے اردو بولی لیکن وہ یہاں رہ کر خود ہی اردو بھولتی جا رہی ہے۔"

گیل نے بوب کے انگریز دادا کی تصویر کے نیچے چمڑے کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ باہر زرد پھولوں والے درخت پت جھڑ کی ہواؤں میں سائیں سائیں کر رہے تھے۔ آج سے ساٹھ ستر سال بعد لیلےٰ کی پوتیاں کہیں گی۔ ہماری دادی ہندوستان سے آئی تھیں۔ (اگر دنیا اس وقت تک باقی رہی)

"ہندوستان میں بہت دنوں تک کئی مرتبہ تمہارے تعاقب کی کوشش کی۔ مگر ملنے کا موقعہ نہ ملا۔ میں اپنی کتابوں کے سلسلے میں بھی بہت سے سوالات کرنا

چاہتی تھی۔ عصمت اور تہذیب نسواں کے تو میں نے سارے فائل کھنگال ڈالے "
گیل نے کہا۔"

گیل اور روب کا کتب خانہ بہت وسیع اور گیل کا اردو ذخیرہ کتب قابل ذکر
تھا۔ اس نے مجھے محمدی بیگم کی سوانح زندگی کا غیر مطبوعہ قلمی نسخہ دکھایا۔ جوان مرحومہ کی
بڑی بہن نے لکھا تھا۔ اور جو وہ میرٹھ یا لاہور جانے کہاں سے کھود لائی تھی۔

شام کو اپنے باورچی خانے میں کھانا پکاتے ہوئے اس نے کہا۔ "پچھلی صدی
کے مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے کہ وہ رجعت پسند اور تنگ نظر تھے۔ اس
وجہ سے اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ میرے خیال میں
یہ تجزیہ صحیح نہیں۔ ذرا ان بزرگوں کے ڈیلیما پر غور کرو۔ ایک ایسی قوم جس کی اپنی
کوئی زبردست تعلیمی روایات نہ ہوں۔ بآسانی مغربی اثر قبول کر لیتی ہے۔ لیکن
ہندی مسلمانوں کی اپنی درسی اور تہذیبی بیحد اعلیٰ اور درخشندہ روایات تھیں۔ اور
اب ان کو احساس دلایا جا رہا تھا کہ وہ روایات ناکارہ اور فرسودہ ہوگئیں۔ مسلمان
عورتیں خود ایک رچے ہوئے تمدن کی خالق اور پروردہ تھیں۔ برطانوی کولونیل رنگ
میں جانا ان کے لئے اتنا آسان نہ تھا۔ ان کا اپنا تہذیبی تفاخر اور برتری کا احساس اور
غرور ان کے اس مدافعانہ رویے میں شامل تھا۔"

"ایک امپیریل قوم جو یک لخت غلام قوم بن گئی۔" میں نے کہا۔ "اس طرح کی
صورتِ حال میں دو رویے ہو سکتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں کا ردِ عمل اور شکست
خوردہ سابق امپیریل ترکی کا ردِ عمل کہ اتاترک نے اسے مکمل مغربی چولا پہنا دیا۔"

پروفیسر گیل مینواَنڈ مسلم تہذیب اور تاریخ کی استاد تھی۔ اگلے روز یونیورسٹی
کے ایک طعام خانے میں راقم الحروف کے لئے جو لنچ دیا گیا۔ اس کے میزبان اطالوی
نژاد جواں سال ماہر اقتصادیات پروفیسر جینوزی صوبہ بہار کے زرعی مسائل کے ماہر

نکلے۔ (اور ان کے نفیس عالیشان دفتر کی دیواروں پر بہار کے ننگے بھوکے ہل کندھے پر اٹھائے کسانوں کی تصویر تکلیف دہ) سینٹر فور ایشین اسٹڈیز کے ڈاکٹر بھرت بھٹ (جغرافیہ)۔ جیمز برو (دینتھر و پولوجی) راجہ راؤ، (فلسفہ) ہربین وان اولفن (اور ہندی اور افریقی ادبیات ولسانیات۔ گائتری - اسپیواک۔ (انگریزی ادب) اور "پبلک لیکچرز کے دفتر" کی ایک خاتون لنچ کے مہمانوں میں شامل تھیں۔ ناولسٹ راجہ راؤ عرصے سے ہندو فلسفہ پڑھارہے تھے اور عنقریب ریٹائر ہونے والے تھے۔ بھرت بھائی گجراتی تھے۔ اور گائیتری انتہائی ذہین بنگالین جو اپنے امریکن یہودی مصنف شوہر سے طلاق لے چکی تھی۔ اس کے سابق خاوند نے طلاق کے بعد اس کے متعلق ناول بعنوان THE BIRDE WORE COLD لکھا تھا جو شائع ہو چکا تھا۔ گائیتری فل پروفیسر تھی اور بیحد بائیں بازو کی وچاردھارا سے تعلق رکھتی تھی۔

ڈچ نژاد پروفیسر وان لفن نے لسانیات کی تجربہ گاہ کے ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں ایک گھنٹے کا انٹرویو بزبان اردو ریڈیو ٹیپ کروایا۔

مشکلیں اتنی پڑیں ہم پر کہ آسان ہوگئیں والا شعر گیل نے فریم کروا کر اپنے دفتر کے کمرے میں لگا رکھا تھا۔ قریب اس کے مرحوم بچے کام کی تصویر رکھی تھی۔ دریچے کے باہر کیمپس کے درخت سرد ہواؤں میں سرسرا رہے تھے۔ صحت مند طلبہ کے خوش پوش غول کسی جگہ کوئی دبلا پتلا لاغر کمزور انسان نظر نہ آیا۔ اور ہر کیمپس پر اتنے ہجوم کے باوجود خاموشی اور سکون۔ کوئی اونچی آواز میں بات نہیں کرتا۔ مصائب اور پریشان حالی کے پیدا کردہ عصابی تناؤ اور جھنجھاہٹ کی وجہ سے بھی ہم لوگ ہر جگہ چیختے چلاتے پھرتے ہیں۔ اونچی آواز میں بولنا قومی خصوصیت بھی ہے۔

دوسرے روز یونیورسٹی میں "جدید ہندوستان کی ہندو اور مسلم عورت" پر لیکچر دینے سے قبل گیل نے تعارف کرواتے ہوئے نذر سجاد حیدر اور ان کی پھوپھی اکبری بیگم

مصنفہ گودڑ کا لال کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکچر کے دوران مجھے گودڑ کے لال کی نہ یاد آگئی۔"
مصنفہ نے اسے لاہور میڈیکل کالج پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔ جو گویا ہندوستانی عورت کی بغاوت اور آزادی کی علامت تھی۔ مگر نقاب پہن کر ڈاکٹری کی تعلیم ممکن نہ تھی۔ وہ بے حد حسین تھی۔ تاکہ لوگ اس پر نظر نہ ڈالیں وہ چہرے پر سیاہ پوڈر مل کر کلاس میں جاتی تھی۔ امریکن سامعین کو یہ قصہ انوکھا لگے گا۔ مگر آج سے سترہ سال پہلے ایک پردہ نشین مصنفہ نے جو تخلیقی اور اپنا آئیڈیل کردار پیش کیا تھا، وہ آج بھی ایک حد تک مشرقی عورت کا مسئلہ ہے۔ روایت کی پابندی اور روایت سے انحراف"۔
بعد میں لامحالہ مسز گاندھی کے متعلق متوقع سوالات ۔

گجراتی نژاد امریکن بھرت بھائی نے دریافت کیا۔ آپ نے کہا تھا کہ ہندوستانی ہاؤس وائف بڑی خود اعتمادی سے مشترکہ خاندان کا انتظام کرتی آئی ہے۔ تو کیا مسز گاندھی کی حکومت ایک ایسا سنڈروم ہے کہ۔

"کوئی سنڈروم نہیں ہے۔ آپ امریکن لوگ نظریہ سازی کے اتنے شوقین ہیں کہ آپ نے فوراً سے پیشتر اس کی بھی ایک تھیوری بنائی"۔ میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ایک دیونی سی میم میرے نزدیک آئی۔ اور اپنا تعارف کرایا۔ وہ اسرائیل کی کسی یونیورسٹی کی لائبریرین تھی۔ اور امریکہ آئی ہوئی تھی۔

"آپ نے برطانوی ہند کی سیاسی شعور والی عورتوں میں ایک مغنیہ گوہر جان کا ذکر کیا کہ اس نے وائسرائے کو ڈیفائی کیا تھا اور یہ کہ وہ یہودی تھی"۔

'ہاں آرمنی یہودی"۔

"اگر وہ یہودی تھی تو آرمنی کیسے ہوئی؟ محض یہودی کہئے۔ ایسے یہودی جو آرمینا میں رہتے تھے"۔

دیکھئے گوہر جان کی یہودی قومیت یا اس کی یہودیت کی شناخت آپ کا مسئلہ

ہے۔ میرا نہیں، میرے لئے وہ ایک ایسی خاتون تھی جس کے اجداد آرمینیا سے کلکتہ آ گئے تھے۔ اور بس"۔

گھنگھریالے بالوں والی اسرائیلی خاتون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بھنا کر دوسری طرف کو ٹہل گئی۔

اب ایک اداس صورت لڑکی نے ذرا نیچی آواز میں کہا"۔

"میں ایرانی ہوں۔ میں اور میرا شوہر یہاں پڑھتے ہیں"۔

وہ خاموش اور سہمی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل کی بات تھی کہ ایرانی طلبا اپنے پیسے کے بل بوتے پر سارے مغرب میں دندناتے پھرتے تھے اور کافی بد دماغ مشہور تھے۔ اب وہ امریکہ میں ہر جگہ گھنا چکے تھے۔ سچ ہے بوا۔ کبھی کے دن بڑے۔ کبھی کی راتیں۔

تیسرے روز راجہ راؤ نے لنچ پر بلایا تھا۔ گیل کے گھر سے نکلتے کلب جاتے ہوئے راستے میں کیمپس کا بازار پڑتا تھا۔ ایک چوراہے پر ہاٹ لگا ہوا تھا۔ لوہمن لڑکے کان میں بندے پہنے ہوئے مختلف دستکاریاں فروخت کر رہے تھے۔ چند نوجوان گٹار بجا کر اپنی موسیقی بیچنے میں مصروف تھے۔ پرانی تصویریں اور ٹیکسس کی ریڈ انڈین گھریلو مصنوعات بک رہی تھیں۔ بڑا پُر سکون اور سہانا دن تھا۔ ایک آدمی اپنے بازی گر کتّے کا تماشا دکھا رہا تھا۔ پُر امن بے فکری کے دن۔ اور اس طرح کے خوبصورت کیمپسوں سے نکل نکل کر لاکھوں کی تعداد میں ایسے خوش باش نوجوان میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ محض ویت نام اور کوریا نہیں۔ دوسری جنگِ عظیم اور اس سے پہلے، اور اس سے پہلے"۔ ایک گولی میرے سینے میں آن لگی، اور موت میرا مقدر ہے"!

ساری دنیا کے نوجوانوں کا گیت ہے۔ ساری "پہلی" "دوسری" اور "تیسری دنیا" کے نوجوانوں کا ترانہ جن کو جنگ کا ایندھن بنایا جاتا ہے۔ یہ دنیا ویدانتی راجہ راؤ کی

رسی نہیں جسے سانپ سمجھ لیا گیا۔ سچ مچ سانپ ہے۔

آراستہ و پیراستہ یونیورسٹی کی طرح فیکلٹی والوں کا طعام خانہ بھی ہلٹن ہوٹل معلوم ہو رہا تھا۔

"ہماری درسگاہیں دراصل اتنی دولت مند اس لئے ہیں امریکن صنعتوں کی طرف سے بھی ان کو بھاری امداد ملتی ہے۔ یہ صنعتیں اپنے ٹیکنولوجسٹ یہاں ٹریننگ کرتی ہیں۔ گبیل نے کہا" اور ٹیکسس تو بہرحال تیل کی وجہ سے بے انتہا دولت مند ریاست ہے"۔

شام کو بوب گیل اور میں شہر کے ایک ریسٹوران میں کھانا کھانے گئے۔ پارک میں ان گنت کاریں۔ اندر بے فکرے چہرے۔ اچانک میں نے گیل سے کہا۔

"یہ لوگ یا کسی بھی امریکن چھوٹے شہر یا بڑے شہر کے لوگ تیسری دنیا کی درماندگی کو سمجھ سکتے ہیں؟"

نہیں" گیل نے افسردگی سے جواب دیا۔

آخری شام گیل کے ہاں ڈنر تھا جسے منسوخ کرنے کے لئے میں نے اسے لاس اینجلز سے فون کیا تھا لیکن جو محرم کی گیارہویں تاریخ پڑنے کی وجہ سے منسوخ نہ ہوا تھا۔ گیل بیگم نے اس شام زرد غرارے کا جوڑا (جو لکھنؤ میں سلوایا تھا) اور جھمکے پہنے اور بریانی پکائی۔ نچلی منزل میں اس کا وسیع ایوان نشست اور باورچی خانہ اور کتب خانہ دانشگاہ کے دانشوروں سے بھر گیا۔ گائتری کہنے لگی۔ اتنے کم وقت میں تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ علی گڑھ تحریک سے متعلق کتابوں سے بھری ایک الماری کے سامنے ایک بزرگ امریکن ماہر اسلامیات کسی سے ایران کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔" اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ہم لوگوں کی کبھی نہیں سنتا"۔

یہ پرانا مسئلہ ہے۔ اہلِ سیاست نے اہلِ دانش کی بات کب سُنی ہے۔

ایک امریکن خاتون ایلیزبتھ فرنیا اور ایک عرب خاتون باسما فطان بزرگان نے ایک ضخیم کتاب "مڈل ایسٹرن ویمن اسپیک رلنا المسلمات فی الشرق الاوسط تیحدثن۔ زنانِ مسلمان خاورمیانہ سخن می گویند" جو انہوں نے مل کر ایڈٹ کی تھی۔ مجھے دی۔ یہ کتاب یونیورسٹی آف ٹیکساس پریس آسٹن اور لندن (برطانیہ) سے شائع ہوئی تھی۔ اور اس میں حضرت عائشہ رضؓ، حضرت رابعہ بصری رحؒ میڈیول

SERPENT AND THE ROPE راجہ راؤ کا مشہور انگریزی ناول ہے۔

افغان شاعرہ رابعہ بلخی، ام کلثوم، خالدہ ادیب خانم مصری لیڈر ہدیٰ شعراوی، جدید عراقی شاعرہ نازک الملائیکہ، الجیرین مجاہدہ جمیلہ بدادی، جدید لبنانی ناولسٹ لیلاے اجنبلی، ایرانی شاعرہ فرخ فرخ زاد وغیرہ کے متعلق مضامین اور ان کی چیدہ تخلیقات شامل تھیں۔ ان ہی جیسی خواتین میں سے ایک۔ جدید ایرانی ماہر تعلیم ڈاکٹر پارسا کو چند ماہ بعد ان کے اپنے ہم وطنوں کا فائرنگ اسکواڈ گولی سے اڑا دینے والا تھا۔ ہیہات۔ ہیہات۔ ان کی پیشرو وزریں تاج طاہرہ کو بھی تو گلا گھونٹ کر اندھے کنوئیں میں گرا دیا گیا تھا۔

اے بپر حرم رسم درہ۔ شاہنشہی چھوڑ۔ گیل کی میز پر محمدی بیگم مرحومہ کی سوانح عمری سامنے رکھی تھی۔ صد شکر کہ انہوں نے اور ان کی نسل کی مصلح، حریت نسواں کی علمبردار خواتین نے کولونیل برطانوی عہد میں جنم لیا۔ مطلق العنانی کے دور میں پیدا ہوئی ہوتیں تو شاید وہ بھی ماری جاتیں۔

باہر سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ گیل کے سیاہ بلے نے کتب خانے کے دریچے میں سے جھانکا اور بے بس انسانوں کو اپنے مسائل کے ناکام حل تلاش کرتے دیکھ کر اکتا کر پھر باغ میں کود گیا۔

ڈکسی مون

یونیورسٹی آف آئیوڈا میں، بید مجنوں سے گھری آئیوڈا ندی کے کنارے استادہ "انگلش اینڈ فلاسفی بلڈنگ" کی چوتھی منزل پر انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ایڈون گنزر میرے سفر کے انتظامات جنات کی طرح منٹوں میں کر دیا کرتا تھا کئی ہفتے قبل اس نے مجھے اطلاع دی تھی۔ "تم نیو اورلینز بطور سیاح جا رہی ہو اور وہاں کسی کو جانتی نہیں۔ میں نہیں چاہوں گا کہ تم وہاں کسی ہوٹل میں قیام کرو۔ میں نے ایک سنگرانش خاتون مسز شیری سلیون کے ہاں تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا ہے۔"

ہاسٹن سے روانگی کی صبح گیل نے مجھ سے کہا۔ "نیو اورلینز بہت بڑا ایرپورٹ ہے۔ وہاں کے جم غفیر میں تم حسب معمول اپنی سلیکس میں ملبوس اترو گی تو ممکن ہے وہ خاتون تم کو میکسی کین یا ایشیائی نژاد امریکن سمجھ کر پہچان نہ سکے۔"

میں نے گیل کے باورچی خانے سے مسز سیلون کو فون کیا۔ ایک نہایت دوستانہ آواز سنائی دی۔ نیو یارک سے لاس اینجلز بھی بات کیجئے تو آواز اتنی صاف سنائی دیتی ہے جیسے مخاطب سامنے موجود ہے۔ میں نے کہا۔

"میں ٹیکساس ایئرلائنز کی فلاں فلائیٹ سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر پہنچ رہی

ہوں۔ گلابی رنگ کا طویل اسکارف اور نیلا اورینٹل ڈریس۔"

"یہ اورینٹل ڈریس کیا چیز ہوتی ہے؟" گیل نے ننھی لیلا کو ناشتہ کراتے ہوئے سر اٹھا کر پوچھا۔

"امریکن ساؤتھ تم باقی امریکنوں کے لئے بھی ایک مختلف دنیا ہے۔ ایڈون نے بتایا تھا کہ یہ ایک خالص سدرن فیملی ہے۔ DEEP SOUTH کے لوگوں کے لئے شمال کے YANKEES ہی خاصے اجنبی ہیں۔ یہ مسز سیون گلابی دوپٹہ اور نیلی شلوار قمیض کیا سمجھ پاتی؟"

"کیا پتہ وہ غرارہ پہنے تمہیں ایرپورٹ پر ملے اور جھک کر تسلیم عرض کرے۔" گیل نے کہا۔

"نہیں لوگوں کے متعلق میرے اندازے عموماً صحیح نکلتے ہیں۔ یہ مسز سیلون بے حد سویٹ اور پر خلوص خاتون ہیں۔ لیکن مشرق کے متعلق کچھ نہیں جانتیں۔"

میرا قیاس درست ثابت ہوا۔

طیارہ ٹیکساس کے بہت بڑے شہر ڈیلاس پہنچا وہی شہر یہاں ۶۳ء میں صدر کینیڈی قتل ہوئے۔ وہاں اتر کر معلوم ہوا کہ نیو اورلینز جانے والی ٹیکساس ایر لائنز سے ٹھیک اسی وقت نیو اورلینز پہنچا دیا جائے گا۔ جس وقت آپ ٹیکساس ایر لائنز سے پہنچیں تو بے حد معذرت کے ساتھ کاونٹر کی لڑکی نے کہا تھرو بکنگ کے ذریعے سامان ایک ہوائی جہاز سے دوسرے میں منتقل ہوتا منزل مقصود پر چلا جاتا ہے۔ پرواز منسوخ ہونے کی وجہ سے میں واحد مسافر تھی جو طیارہ تبدیل کر کے اس پرواز سے نیو اورلینز جا رہی تھی۔ ایک کارکن بار بار معافی چاہتا کار میں بٹھا کر دوسری طیران گاہ میں لے گیا۔ دوسری ایر لائنز کے لاؤنج میں پہنچا کر ایک بار پھر معذرت چاہی اور واپس گیا۔

نیو اورلینز پر میرا ایک بیگ غائب ہو گیا۔ میں نے متعلقہ دریچے والے سے کہا۔ اس نے مزاحمت سے جواب دیا۔ ایسی گڑبڑ شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ اپنی جائے قیام کا پتہ دیجئے۔ آج شام کے چھ بجے سے قبل بیگ آپ کو مل جائیگا۔

مسٹر اور مسز سیلون بھی غائب تھے۔ میں نے اس آدمی سے اس کا نام اناؤنس کرایا۔ چند منٹ میں ایک خوش شکل متوسط العمر جوڑا مع ایک بچی نمودار ہوا۔

"ہم ٹیکسس ایر لائنز والی فرودگاہ میں منتظر تھے۔" مسز سیلون نے کہا۔

سیلون نام سے ظاہر ہوتا تھا کہ موصوف آئرش نژاد کیتھولک تھے وہی نکلے۔ شیری سیلون ورجینیا کی انگریز نژاد کیتھولک تھی۔ (یاد کیجئے ورجینیا وہ پہلی نو آبادی تھی جو سر والٹر ریلے نے ۱۶۰۷ء میں بسائی تھی)

"لیکن میرے دادا محض سو سال قبل انگلستان سے آئے تھے۔" شیری نے کہا جن کا لب و لہجہ اب تک خاصہ برطانوی تھا۔

"راستے میں ہم لوگ ذرا اپنی پوتی کی سالگرہ پارٹی میں شریک ہوتے چلیں۔" شیری بولی۔ "میرا بیٹا بہو عنقریب ایک دوسرے کو طلاق دینے والے ہیں بیٹا دوسرے گھر میں اٹھ گیا ہے۔ بچی کی سالگرہ کے لئے آجائے گا۔"

ایک رہائشی علاقے میں ایک نئی وضع کے بنگلے کے اندر ایک معمولی شکل کی لڑکی نے استقبال کیا۔ کمرہ نشست میں چند مہمان موجود ہیں۔ ایک طرف منی سی ڈائننگ ٹیبل پر منا سا لفری ٹی سیٹ رکھا تھا۔ ننھی ننھی کرسیوں پر چند بچے بیٹھے تھے۔ چند منٹ بعد ایک بے انتہا خوبصورت نوجوان، گھنگھریالے سنہرے بال (اسے ہالی ووڈ میں ہونا چاہیئے تھا۔) کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سیلونز کا لڑکا تھا۔ خالص اولڈ ورلڈ سدرن کرسٹی کے ساتھ تقریباً رکوع میں جا کر اس نے مجھے سلام کیا تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی امریکی ساؤتھ میں موجود ہوں

یہاں آج ۱۹۷۹ء میں بھی امریکن خانہ جنگی۔ ۱۸۶۵ء سے قبل کی پرانی یورپین کلچر باقی ہے۔ لڑکا اپنی بچی سے کھیلتا رہا۔ بیوی سے بات نہیں کی۔ دوسری منزل پر اس کی بیوی موجودہ دوست رہتا تھا۔ طلاق حاصل کرنے کے بعد وہ اس سے بیاہ کرنے والی تھی۔ اس آدمی کا چھوٹا بھائی بھی پارٹی میں موجود تھا۔ دونوں بھائی ـــــ SHOW BUSINESS میں تھے چھوٹا بھائی بچوں کو طرح طرح سے محفوظ کر رہا تھا۔

"یہ دونوں بھائی نیو اورلینز کے اصل فرانسیسی نژاد باشندے ہیں"

کرسمس آنے والی تھی کچھ دیر بعد بہو کا منگیتر فادر کرسمس کے بھیس میں داخل ہوا۔ اس سال کمپیوٹرائیزڈ کھلونے بازار میں آچکے تھے۔" فادر کرسمس" ہر بچے کو گود میں بٹھا کر بڑے اخلاق سے اس کی فرمائش پوچھتا۔

"سر۔ آپ کو کیا چاہیئے؟"

"مادموزیل۔ آپ کو کیا چاہیئے؟" اور ہر بچہ اور بچی کسی کمپیوٹرائزڈ کھلونے کا نام لے دیتی (جن کی کئی ماہ قبل سے ٹیلیویژن پر زبردست پبلسٹی کی جارہی تھی۔)

شیری کا لڑکا شکیل اپنے رقیب" فادر کرسمس" سے باتیں کرتا رہا۔ جو عنقریب اس کی بچی کا سوتیلا باپ بننے والا تھا۔ سارا ماحول بیحد مہذب اور پر تکلف تھا۔ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ گھر ٹوٹ چکا ہے۔

لڑکے کی چار سالہ بچی اطمینان سے" فادر کرسمس" کی گود میں بیٹھی رہی۔

"تم سے ملوانے کے لیئے ہم نے آج ہی نیو اورلینز کے ایک قدیم خاندان میں چند لوگوں کو جمع کیا ہے۔ کیونکہ ایڈون کنزر نے آلیو واسٹی سے مجھے فون پر بتایا تھا کہ تم امریکن ساؤتھ کی تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔" شیری نے اپنی بہو کے گھر سے ہوئے کہا۔

"انڈیا میں تم کون لوگ آباد ہو۔ بدھسٹ؟ موزلم۔؟" مسٹر سیلون نے دریافت کیا۔

میرا یہ قیاس کہ بہت معصوم لوگ ہوں گے صحیح نکلا۔

ان کے بہو بیٹے کے اس موڈرن مکان سے نکل کر ہم لوگ ایک روائتی سدر
محلے میں پہنچے۔ جہاں خیاباں کے دونوں جانب استادہ کولونیل مکانات بالکل
ولیمز کے ڈرامے "جلتی ٹین کی چھت پر بلی" والے سیٹ معلوم ہوتے تھے۔

ایک مکان کے چوڑے برآمدے اور سفید جھلملیوں والے دروازوں کے عقب
میں خنک ڈرائنگ روم کے اندر چند معمر لوگ ٹیلی ویژن پر "بال گیم" دیکھنے میں منہمک
تھے کہ بیس بال امریکہ کا قومی کھیل ہے۔ جین سلیون نے طیارے کی پرواز منسو
ہونے کا واقعہ بتایا۔ حاضرین نادم ہوئے "ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ امید ہے
آپ کو زیادہ زحمت نہ ہوئی ہوگی" وغیرہ وغیرہ۔

صاحب خانہ امریکن بحریئے کے ریٹائرڈ کمانڈر تھے۔ (جین سلیون بھی ا
بحریئے کے شعبہ انجینئرنگ کے ریٹائرڈ کمانڈر تھے اور اب انجینئرنگ کے ر
کا ذاتی کارخانہ چلاتے تھے)۔

صاحب خانہ کی بیوی نے اپنی خوابگاہ دکھائی جس میں اٹھارہویں صدی کا
کھٹ رکھا تھا۔ سرہانے میز پر نہایت ضخیم مصور بائیبل جس کے اولین اوراق پر اس
کے پچھلے ڈھائی سو سال کی نسلوں کی پیدائش، شادی اور اموات کی تاریخیں درج
جاتی رہیں تھیں باورچی خانہ اور باقی گھر بیحد موڈرن۔

شام کے چھ بجے جب ہم لوگ سلیونز کے مکان واقع والمونٹ اسٹریٹ
میرا بیگ برآمدے میں موجود تھا۔ جو ڈیلاس سے کسی فلائیٹ پر منگوا کر حسب و
چھ بجے شام سے قبل گھر پر پہنچایا جا چکا تھا۔

اس خیاباں میں بھی دورویہ چار جین کولونیل دو منزلہ مکان چوڑے پتوں والے ٹ
درختوں میں گھرے کھڑے تھے سارے امریکہ کے مکانوں کی طرح ایک سے ایک خوش و

سلیونٹر کے تینوں لڑکے الگ رہتے تھے۔ بڑی لڑکی کا نام برجیٹ آئرش نام ہے چھوٹی
ہ سالہ ٹفن اسکول جاتی تھی اس کا نام شیری کے انگریزی کے پس منظر کی یادگار تھا۔
قاتِ فرصت میں شیری تانبے کی مجسمہ سازی کرتی تھیں۔ شوقیہ فن کار تھیں۔ اپنے پائیں
غ کے کاٹج میں اسٹوڈیو تھا۔

شام کے وقت شیری کے بیٹے اور بہوئیں آجاتیں جو لڑکا اپنی بیوی کو طلاق دے نہ ہا
ھا وہ موجودہ گرل فرینڈ کے ساتھ آتا۔ زرعی قدامت پرست ساؤتھ میں خصوصاً کینتھولک
نبوں میں احساس یگانگت شمال کے مقابلے میں زیادہ معلوم ہوا صنعتی تمدن کی بیگانگی ابھی
بنوب میں شاید اس حد تک نہیں پھیلی تھی۔ پچھلی لاؤنج میں میز پر کرسمس کے تحائف کے کیٹیلاگ
کھے تھے۔ ایک اشتہار اس قسم کے غبارے کا تھا جو میں نے ورمونٹ سے نیویارک آتے
ہوئے راستے میں اڑتا دیکھا تھا۔ اشتہار کے نیچے لکھا تھا۔"اس کرسمس پر اپنی بیوی یا محبوبہ
و یہ تحفہ دیجئے۔ قیمت صرف پچاس ہزار ڈالر" شیری نے جین کو وہ تصویر دکھلائی اور ہنسنے لگیں۔
"اتنا قیمتی تحفہ کتنے لوگ خریدیں گے ؟" میں نے دریافت کیا۔
"بہت سے" جین سلیون نے کہا۔"ٹیکسس کے کروڑپتی اور بہت سے لوگ ہم البتہ
ہیں خرید سکتے ہے" (یہ دو کاریں رکھنے والی اور ہر دوسرے سال یورپ سیر کے لئے جانے
الی ایک مڈل کلاس فیملی تھی۔)

"ہمارا سب سے بڑا لڑکا انٹلکچوئیل ہے۔ ایک یونیورسٹی میں امریکن ہسٹری پڑھاتا ہے۔
س نے ایک نصف الجیرین نصف فرانسیسی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ کیتھرین خود لامذہب
ہے، لیکن کہتی ہے کہ اگر کبھی مذہب کی طرف راغب ہوئی تو اپنے باپ کا دین اسلام قبول
رے گی۔" شیری نے کہا۔"کل شام اس نے تم کو ڈنر پر بلایا ہے۔ ذرا مذہب کے بارے میں
س کے خیالات معلوم کرنا۔"
شیری غالباً خواہشمند تھیں کہ کیتھرین بھی اپنی فرانسیسی ماں کی طرح رومن کیتھولک مذہب

اختیار کرے۔ مگر تکلف اور فرد کی آزادی رائے کے احترام کی وجہ سے اس موضوع
پر اس سے کچھ کہہ نہ سکتی تھیں۔

"میرے والد فرانس میں رہتے ہیں۔ میں کبھی الجیریا نہیں گئی۔ مگر میرے چچ
فرانس آتے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے ان کی لڑکیاں الجیریا میں کس قدر پا
زندگیاں گزارتی ہیں۔ اپنی مرضی کی شادی بھی نہیں کر سکتیں۔ مسلم سوسائٹی میں ع
کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟" کیتھرین نے اپنے گھر میں میز پر بڑھیا ف
کھانا چنتے ہوئے کہا۔ "ہر فرانسیسی ماں اپنی بیٹی کو بہترین ککری بک جہیز میں د
ہے۔ میں نیو اورلینز سیر کے لئے آئی تھی۔ یہاں اس نستعلیق مہذب سدرن
لڑکے سے شادی کر لی۔ ماماں مجھے پیرس سے برابر کھانوں کی نت نئی ترکیبی
بھیجا کرتی ہیں۔"

دوسرے کمرے میں مہمان جمع تھے۔ ایک انگریز لڑکا اور اس کی فرنچ بیو
جو کیتھرین کی طرح ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ملازم تھے۔ فرانسیسی قونصل خانے
ایک نوعمر ڈپلومیٹ اور ایک باریش امریکن نوجوان جو باتوں سے نہایت رجعت
پسند جنوبی معلوم ہوتا تھا۔ سابق شاہ ایران کی تعریفوں میں مصروف تھا۔

"مگر میں جانتا ہوں شاہ نے کتنے مظالم کئے تھے۔ فرانس کے اخباروں م
تمام تفصیلات چھپتی تھیں۔" فرانسیسی ڈپلومیٹ نے کہنا شروع کیا۔ امریکن رجع
پسند نے اس کی بات کاٹی۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ گوری اقوام کی نس
برتری کے نظریئے کا حامی بھی تھا۔

شیری کا لڑکا کیتھرین کا شوہر ٹیپکل سوبر یونیورسٹی کا استاد معلوم ہوتا تھ
موٹے سیاہ فریم کی عینک، مدھم پرسکون جنوبی DRAWL کا لہجہ (جس طرح د
اردو بولتے ہیں۔ امریکن ساؤتھ کے لوگ اس انداز سے انگریزی)

انگریز نوجوان کچھ دیر تک بارلش رجعت پسند کی گفتگو سننے کے بعد مجھ سے آہستہ سے بولا "یہ آدمی بالکل بیوقوفی کی باتیں کر رہا ہے۔"

"تم کو امریکہ کیسا لگا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ناقابلِ یقین" انگریز نوجوان نے برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ دیا۔

جس قسم کا یہ آدمی ہے شاید اسی طرح کے لوگ KUKLUX KLAN کے سفید برقعے اوڑھتے ہوں گے" میں نے کہا۔

ہندوستان میں بھی تو اچھوتوں کو LYNCH کیا جا رہا ہے" انگریز نوجوان نے جواب دیا۔

"پرانے تعصبات جدید اقتصادیات سے غلط ملط ہو کر بڑی تباہی پھیلاتے ہیں" میں نے کہا۔

امریکہ میں شمال کی آزاد خیالی اور جنوب کی قدامت پرستی اور کالوں سے تعصب کے جنوبی رویئے امریکن خانہ جنگی کی یادگار ہیں۔

۱۷۹۳ء میں اسپلنگ جینی ایجاد ہوئی۔ اس کی وجہ سے صنعتی انقلاب آیا۔ ادھر ہندوستان مانچسٹر کو خام سپلائی کرنے والی نوآبادی بنا۔ اُدھر امریکن ساؤتھ میں کپاس کی مزید کاشت کے لئے افریقی غلاموں کی تجارت (جو سترھویں صدی سے جاری تھی) بڑھی۔ شمالی ریاستوں کے جمہوریت پسند لوگ جنوب کے سیاہ فام غلاموں کی آزادی کے حامی تھے۔ اہلِ جنوب کے سیاہ فام غلاموں کی آزادی کے حامی تھے۔ اہلِ جنوب اس کے مخالف تھے ان کی دولت و راحت کا دارومدار غلاموں کی محنت پر تھا۔ جب ری پبلکن ابراہیم لنکن ۱۸۶۰ء میں صدر منتخب ہوئے جنوبی ریاستوں نے یونین سے علیحدہ ہو کر کون فیڈریٹ اسٹیٹس آف امریکہ کی تشکیل کی۔ شمال سے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ۶۵-۱۸۶۱ء لاکھوں مارے گئے۔ (یہ خانہ جنگی امریکن قومی اساطیر کا

ایک اہم حصہ بنی) جنوب کو شکستہ غلام آزاد۔ لیکن ابراہیم لنکن کو ایک جنوبی انتہاپسند نے قتل کر دیا۔ شمال اور جنوب کے مابین تلخی باقی رہی۔ خانہ جنگی نے جنوب کو اقتصادی طور پر تباہ کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر میں سنبھلا۔ شمال نے تیزی سے ترقی کی۔ خانہ جنگی کے بعد ہی سرمایہ داری سرعت سے آگے بڑھی فولاد اور مشین کی اس نئی دنیا میں اَن گنت عظیم الشان شہر آباد ہوئے۔ اس بے اندازہ انڈسٹریل طاقت کے ساتھ ساتھ جرائم اور کرپشن میں بھی اضافہ ہوا۔ شمال کی صنعتی ترقی کے مقابلے میں ساؤتھ پھسڈی رہ گیا۔ کپاس اور گنے کے زمینداروں کی فیوڈل روایات کو یاد کرتا رہا۔ آج تک ساؤتھ کے "غریب گورے" ایک مسئلہ ہیں۔ اور کالوں سے وہی سب سے زیادہ متنفر۔ کوکلکس کلان ان کی اس نفرت کی علامت ہے۔ اپنے حقوق کے لئے کالوں کی عظیم جدوجہد امریکن اساطیر کا ایک ولولہ خیز اور تابناک حصہ ہے۔

باوجودیکہ شیری ایک نیک دل روشن خیال اور حساس خاتون تھیں۔ لاشعوری طور پر کالوں کے خلاف تعصب ان کے اندر بھی اسی طرح موجود تھا جس طرح مثال کے طور پر ایک آزاد خیال تعلیم یافتہ مدراسی برہمن غیر برہمنوں یا اچھوتوں کے لئے اچانک اپنا رویہ ظاہر کر دیتا ہے۔

کالوں کے لئے شیری کا سرپرستانہ آقاؤں والا انداز بھی باقی تھا۔ ٹیلی ویژن لاؤنج میں ایک کالی عورت کی بڑی پینٹنگ رکھی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اس کالی عورت کا برنجی سر۔ دونوں فن پارے شیری نے بنائے تھے۔ "یہ ورجینیا میں میری والدہ کی پرانی نیگرو خادمہ تھی۔ نہایت وفادار اور تمیزدار بیچاری مرگئی۔" شیری نے بالکل اس طرح کہا جیسے اودھ یا روہیلکھنڈ کی کوئی بیگم صاحبہ اپنی کسی خانہ زاد وفادار مرحومہ باندی کا ذکر کرتی ہوں۔

ایک روز ہم غریب کالوں کے محلے سے گزر کر ڈاؤن ٹاؤن جا رہے تھے۔ ہر کاٹج کے سامنے ایک ایک نئی کار کھڑی تھی۔ کچھ غریب کالے اپنی کاریں دھونے میں مصروف تھے۔ سڑک پر کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ سامنے ایک عظیم الجثہ اشتہار میں ایک کالی موڈل لڑکی کوئی قیمتی چیز خریدنے کی دعوت دے رہی تھی۔

"ان لوگوں کو اب تمام مراعات حاصل ہو چکی ہیں پھر بھی شاکی رہتے ہیں"۔ شیری نے اظہارِ خیال کیا۔ (ہمارے ہاں کہا جاتا ہے "ہریجنوں کو سب کچھ مل رہا ہے پھر بھی شاکی"۔)

ہمارے اور مغرب کے SLUMS میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نہ ہم نے اپنے افلاس کا مقابلہ امریکن افلاس سے کر سکتے ہیں۔ محمد علی کلے اپنی سوانح حیات میں رقم طراز ہیں کہ "ہم لوگ اتنے غریب تھے کہ ہمارے باپ کے پاس ایک دس سالہ پرانی کار تھی اور وہ بھی کبھی نئے ٹائر نہ خرید سکتا تھا۔ اور ہمیشہ سیکنڈ ٹائروں سے کام چلاتا تھا"۔

یہاں محمد علی کلے کی "نیشن آف اسلام" کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ سب سے پہلے ۱۹۱۶ء میں بیرونِ امریکن چرچز "کرسچن سائنس" کے موتھی ڈریو نامی ایک نیگرو نے مورش سائنس ٹمپل قائم کیا۔ (قرونِ وسطیٰ سے مغرب میں مسلمان افریقیوں کو مُور یعنی مراقشی کہا گیا ہے۔ یورپین ہسپانوی مسلمان بھی مُور کہلائے۔ یورپین نشاۃ ثانیہ کی مصوری اور ادب میں (BLACKAMOOR) موجود ہے) نو مسلم نوبل ڈریو علی نے دعوئے نبوت بھی کیا۔ ہر مہدویت یا نبوت کے دعوے دار کی تحریک کی طرح یہ بھی ایک نیم مذہبی نیم سیاسی تحریک تھی۔

ڈریو علی کا اسلام بھی ذرا انوکھا سا تھا۔ کالوں کی (MYSTICAL STREAK) ان کے مصائب کی پیداوار ہے۔ اس نے امریکن مسیحی کالوں کے وہ لازوال روحانی

نغمے NEGRO SPIRITUALS تخلیق کئے۔ (نیو یارک مین ہیٹن میں ہرا بر سے گزرتے ایک کالے بوڑھے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر آپا بہن نے کہا تھا کیا بات ہے کہ ہر بوڑھے کالے کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ انکل ٹام ایسے ہی رہے ہوں گے۔) تو بہر حال دپیغمبر، نوبل ڈریو علی نے "قرآن مقدس" (نعوذ باللہ) شائع کیا جو در اصل ایک مسیحی تصوف کی کتاب اور چینی تبتی عارفانہ اقوال کے مجموعے پر مبنی تھا۔

موریش سائنس ٹمپل دراصل امریکن کالوں کی سیاسی بیداری کا ایک مظہر تھا۔ مغرب میں جس طرح کالوں کی تحقیر کی جاتی رہی تھی جواباً اس "صحیفے" میں علی نے لکھا تھا کہ ایشیائی اقوام کی تخلیق الوحی تھی اور افریقہ برتر تھا۔ ڈریو علی امریکہ سے باہر ایک نیگرو ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔ اور کالوں کی معاشی مسائل کا حل اس کے ٹمپل کے اغراض و مقاصد میں شامل تھا۔

دوسری زیادہ کامیاب "بلیک مسلم" کساد بازاری کے زمانے میں شروع ہوئی اس کا بانی ویلیس فرڈ تھا۔ چارلس ایرک لنکن نے بلیک مسلمانوں پر اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ چونکہ عربی میں "فرد" کے معنی واحد کے ہیں۔ FARD کو "اللہ" سے بھی مماثل کیا جانے لگا۔ ایلائی یاہ محمد فرڈ کے جانشین اور "پیغمبر" بنے۔ یہ بھی گوروں کی مخالف تحریک تھی۔ گو ایلائی یاہ محمد اپنی مدافعت کے وقت تشدد استعمال کرنے کے علاوہ اہنسا کے مبلغ تھے۔ ان کے لڑکے اکبر محمد نے جامعہ الازہر میں دو سال پڑھا۔ ان کا سب سے مقبول اور بے حد ذہین پیرو میلکم لٹل میلکم ایکس کے نام سے نیو یارک مسلم ٹمپل کا لیڈر بنا۔ وہ کالوں پر پولس کے مظالم کے جواب میں تشدد استعمال کرنے کا حامی تھا۔ گو اپنے پیشوا کے اہنسا کے اصول پر کاربند رہا۔ سیاہ فام امریکہ کے اس نہایت قابل پُرجوش لیڈر اور اعلیٰ درجہ کے مقرر الحاج میلکم ایکس کو نیو یارک میں ایک تقریر کرتے ہوئے ۲۱ فروری ۱۹۶۵ء کے روز شہید کر دیا گیا۔

محمد علی کلے نیشن آف اسلام کے ایک بے حد جوشیلے رکن ہیں۔ کالوں میں ایک بے حد کٹر قسم کا "حنفی مسلم" فرقہ بھی ظہور میں آچکا ہے۔

جس سال امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہوئی یعنی ۱۸۶۱ء میں ایک امریکن مشنری خاتون مس ازابلا تھوبرن نے شہر لکھنؤ میں لڑکیوں کا ایک سکول قائم کیا۔ (اس وقت جان عالم واجد علی شاہ اختر پیا کو مٹیا برج سدھارے صرف چار سال ہوئے تھے) یہ جوشیلی امریکن باہمت خدا پرست خواتین دور دراز امریکہ سے ہندوستان آئی تھیں کہ عورتوں میں جدید تعلیم کی روشنی پھیلائیں۔ اس طرح کے امریکن پریسپی ٹیرین اسکول دہرہ دون لاہور اور دوسری جگہوں پر کھلے اور اے۔پی مشن سکول کہلائے۔ لیکن رفتہ رفتہ ازابلا تھوبرن کالج لکھنؤ نے اپنی خالص امریکن روایات، مکمل امریکن سٹاف اور بے حد اعلیٰ معیار کی تعلیم کی وجہ سے اوپری طبقہ کے لئے ایک خاص SNOB VALUE بھی اختیار کر لیا۔ (یہی اسنوب ویلیو نینی تال اور مسوری کے امریکن سکول کے لئے آج تک موجود ہے۔)

اس ازابلا تھوبرن کالج کی تقریبات میں جو کمیونٹی سونگ ہم لوگ گاتے تھے۔ اس کا اصل پس منظر اب جاکر معلوم ہوا۔ کیلیفورنیا میں مجھے "مائی ڈارلنگ کلمنٹائن" یاد آئی تھی جس کا گولڈ رش والا FORTY - NINER باپ تھا اور جو روز صبح ۹ بجے ندی میں سے اپنی بطخیں ہنکا کر لے جاتی تھی، اور ایک دن پانی میں ڈوب گئی تھی۔

ایک بشاش گیت جو ہم ہندوستانی لڑکیاں بڑی مسرت و شادمانی سے گاتے تھے یوں تھا۔

"پولی ڈولی ڈوڈل گاتا میں اپنی سیلی سے ملنے ساؤتھ گیا اپنی سوزی اینا سے ملنے لوزیانہ جا رہا ہوں۔ راستے میں ایک ندی پڑی۔ گاتے ہوئے میں اسے پار نہ کر سکا۔ تو میں ایک نگر پہ سوار ہو گیا کیونکہ میں اسے ایک گھوڑا سمجھا۔ ریل روڈ

ٹریک پر ایک جھینگر بیٹھا تھا۔" وغیرہ۔

یہ کورس سفید جنوب کی نفسیات اور ایتھوس کا عکاس تھا۔ مگر جب ہم پیانو کے ساتھ اسے گاتے تو ہم کو مطلق ہوش نہ تھا کہ کیا گا رہے ہیں۔

لیکن کالوں کے متعلق چند المناک اور دلنشیں گیت بھی تھے۔ میرا پسندیدہ نغمہ MY OLD KENTUCKY HOME تھا جو میں پیانو پر بجاتی تھی۔"کین ٹکی کے اس پرانے مکان پر سورج تیزی سے چمک رہا ہے۔ ڈارکی لوگ مسرور ہیں گیہوں کی فصل پک گئی۔ مرغزار سرسبز۔ چڑیاں دن بھر گاتی ہیں بچے جھونپڑے کے فرش پر لوٹ لگاتے ہیں، سب خوش ہیں۔

"رفتہ رفتہ بُرے وقت نے دروازے پر دستک دی۔ اب وہ لوگ جنگل اور پہاڑی اور ساحل پر شکار نہیں کھیلتے۔ کاٹج کے دروازے کے سامنے پرانی بنچ پر بیٹھ کر چاندنی رات میں گیت نہیں الاپتے۔ وقت آگیا ہے کہ ڈارکی یہاں سے چلے جائیں۔ شب بخیر۔ میرے پرانے کن ٹکی کے مکان شب بخیر۔ لیڈی! اور اب مت روؤ۔ آج اور مت روؤ۔ ہم کن ٹکی کے پرانے گھر کی یاد میں ایک گیت گائیں۔ وہ گھر جو بہت دور رہ گیا۔"

اور میرا بیحد پسندیدہ غیرفانی نیگرو گیت OLD FOLKS AT HOME سوانی دریا کے کنارے بہت دور۔ بہت دور ہیں وہیں واپس جانا چاہتا ہوں۔ جہاں میرے بوڑھے ماں باپ رہتے ہیں۔ ہیں ساری ساری دنیا میں اداس گھومتا ہوں۔ مجھے میرے پلانٹیشن واپس لے چلو جہاں میرے بوڑھے ماں باپ رہتے ہیں۔"

یہ ایک ایسا جذباتی رقت خیز کورس تھا جسے گاتے گاتے لوگوں کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔" میڈسن ڈکسن لائن" کی سرحد کے نیچے کی" غلام ریاستیں"

جو ڈکسی لینڈ کہلاتی تھیں ان کی نیگرو میوزک بے مثال ہے۔
اتوار کی صبح میں شیری جین سلیون کے ساتھ کیتھڈرل گئی۔ جس وقت ہم کلیسا کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک رولز رائس آ کر رکی۔ میک اَپ سے لیس ہیروں سے لدی سیاہ ویل پہنے ایک ضعیفہ اپنی پوتی کے سہارے کار سے برآمد ہوئیں۔ بہو نے ان کا ویل درست کیا۔ بیٹے کا بازو تھام کر وقار سے چلتی اندر گئیں۔ شاید کسی پرانے پلانٹر کا خاندان تھا اور گارڈن ڈسٹرکٹ سے آیا تھا۔
اندر کیتھڈرل میں ماس کے بعد (حاضرین میں کوئی کالا چہرہ نظر نہ آیا) لاٹ پادری نے ممبر پر آ کر کہا "ہمارے جو بھائی آئی رین میں محبوس ہیں آؤ ان کے لئے دعا کریں۔"
۱۸۰۳ء میں ریاست لوزیانہ امریکہ نے فرانس سے خریدی تھی۔ نیواورلینز فرنچ ہسپانوی کنکشن کی وجہ سے زیادہ تر رومن کیتھولک ہے۔ تین مشہور عالم کیتھولک یونیورسٹیاں اس شہر میں موجود ہیں۔ تولان، لایولا، زیویرز۔ باقی یونیورسٹیاں ان کے علاوہ اور دنیا کے حسین ترین خیابانوں میں سے ایک سینٹ چارلس اسٹریٹ جس پر اب تک اسٹریٹ کاریں چل رہی تھیں۔
"تم کو یقین نہیں آئے گا۔ ذرا جھانک کر غور سے دیکھو۔ وہ اسٹریٹ کار جو سامنے سے آ رہی ہے۔ اس کا نام "DESIRE" ہے"۔ شیری نے کیتھڈرل سے لوٹ کر سینٹ چارلس اسٹریٹ واپس آتے ہوئے کہا۔ خیابان کے دونوں طرف پر شکوہ کولونیل مکانات۔
چند ہوٹلوں نے انیسویں صدی کا یورپین ڈیکور باقی رکھا تھا۔ کرسمس کی وجہ سے ہوٹل پرستان بنے ہوئے تھے۔ باہر قدیم کاٹی آلودشاہ بلوط جن

کے نیچے ایک زمانے میں ڈوبیل لڑے جاتے تھے۔ نوتردام کا مذہبی مدرسہ۔ تاریخی فرنچ کوارٹر پر خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور اتوار کا سکون فرانسیسی ناموں والی سڑکوں پر سیاحوں کے لئے بگھیاں چل رہی تھیں۔ ایک خاموش چوراہے پر جینز میں ملبوس ایک باریش نوجوان (جو ہپی نہیں تھا) گٹار پر جنوب کے نغمے سنا رہا تھا۔ قدموں میں اس کے ساز کا کیس سکوں کے لئے کھلا رکھا تھا۔ ایک گیت ختم کرکے اس نے کہا۔ اب میں اپنا مذہبی گانا سناؤں گا۔" پھر اس نے ایک انگریزی بھجن شروع کیا۔ "کرشنا۔ کرشنا!"

نوتردام اور لایولا اور سینٹ زیویرز کی اس کیتھولک دنیا سے وہ بھی روحانی طور پر ارپٹ آؤٹ کر چکا تھا۔

ایک معصوم صورت لڑکا سائیڈ واک پر اسٹول بچھائے اکارڈین بجا رہا تھا۔ ایک تماشہ گھر کے باہر بے حد حسین نیم عریاں رقاصاؤں کی تصاویر چسپاں تھیں۔ دروازے کے اوپر لکھا تھا۔ "دنیا کے خوبصورت ترین لڑکے" یہ رقاصائیں دراصل "تیسری جنس" والے DRANSVESTITES تھے۔ فرنچ کوارٹر مع بوربون اسٹریٹ اپنے بیہودہ تماشوں کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔

"سان فرانسسکو کے بعد نیو اورلینز تیسری جنس والوں اور GAY لوگوں کا ہیڈکوارٹر ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان کافی رابطہ رہتا ہے۔" شیری نے ہنس کر کہا۔

اس وقت میں نے ایک بات نوٹ کی۔ جب میں اور شیری اس تماشا گھر کے سامنے رک کر تعجب سے وہ تصاویر دیکھ رہے تھے۔ جین سلیوں ٹہلتے ہوئے دور چلے گئے۔ اور جب تک ہم دونوں وہاں سے آگے نہیں بڑھے وہ وہیں ٹھٹکے رہے۔ یہ ایک قدامت پسند، مہذب، پرانی اخلاقیات کے پابند وضعدار سدرن جینٹلمین کا بے ساختہ رد یہ تھا جو مجھے بھلا معلوم ہوا ایک قدامت پسند وضعدار ہندوستانی بھی یہی کرتا۔

ایک چوک میں میڈیول یورپ کے بازی گر کی پوشاک پہنے ایک خوبرو نوجوان نٹ نے مجمع لگا رکھا تھا۔ لیکن سب تماشائی خاموش۔ شور و غل ناپید۔ ایک طرف بہت سارے آرٹسٹ تصویریں بنانے میں مشغول تھے یا اپنی تصاویر بیچ رہے تھے۔ ایک بنچ پر ایک بوڑھا کوچہ گرد مغنی ایک کاؤبوائے گیت کی YOODLING میں مصروف تھا۔ ایک اور چوک میں ایک بوڑھا حبشی چھتری لگائے رقص کر رہا تھا۔ اس کے گرد بھی تماشائیوں کی بھیڑ تھی۔ نیو اورلینز نیگرو جاز کی جائے پیدائش ہے۔ ایک جگہ وہ منڈی تھی جس میں امریکن خانہ جنگی سے قبل نیگرو غلام نیلام کیے جاتے تھے۔ ایک دوکان کے باہر D - SHIRTS آویزاں تھیں جن پر NUKE IRAN چھپا تھا (یعنی ایران پر نیوکلیر بم گرا دو)۔ بحری قزاقوں کی گلی کے قریب ایک اوپن ایئر ریسٹوران میں لوگ باگ انوار منا رہے تھے جیکسن اسکوائر اور بندرگاہ کے سامنے ریل کی پٹڑیوں پر سے مال گاڑیاں گزر رہی تھیں۔
مارک ٹوین کے دریا مسس سپی پر جہاز چل رہے تھے۔ فضا میں ڈکسی لینڈ کی رومینٹک موسیقی مرتعش تھی۔ ٹینیسی ولیمز کے ڈرامے A STREET CAR NAMED DESIRE کی سیٹنگ والے فرنچ کوارٹر میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔
صبح سویرے شاہ بلوط اور میگنولیا اور شمشاد اور پامیٹو اور بید مجنوں سے ڈھکے ساحلوں سے ہٹ کر اسٹرن وہیلر اسٹیم بوٹ "COTTON BLOSSOM" تاریخی یادگار کے سامنے سے گزری جہاں ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ عہد مارک ٹوئن کی وضع کے اس جہاز میں بھی پہیئے لگے تھے۔ مگر وہ بطور آرائش پانی گرا رہے تھے۔ میں اسی طرح کے جہاز پر ہزاروں میل دور شمالی ریاست الی نوائیں اسی دریا مسس سپی پر سفر کر چکی تھی۔
"کپاس کا شگوفہ" اب اس جگہ کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ جہاں بدنام

زمانہ ژاں لیفیت اور اس کے بحری قزاق رہا کرتے تھے۔ ژاں لیفیت ایک خوفناک اسمگلر تھا۔ ۱۸۰۸ء میں جب ریاستہائے متحدہ نے نیگرو غلاموں کی درآمد پر پابندی لگائی۔ اس شخص نے اپنی آمدنی جاری رکھنے کے لئے اپنے جہازوں کے کپتانوں کو حکم دیا کہ دشمن برطانیہ اور دشمن فرانس کے جہازوں پر چھاپہ مار کر قبضہ کر لیں۔ ۱۸۱۴ء میں جنگ کے دوران ایک برطانوی کپتان نے ژاں لیفیت کو رشوت دینا چاہی کہ وہ نیواورلینز پر فوجی قبضہ کرنے میں اس کی مدد کرے تب اچانک لیفیت کا جذبہ حب الوطنی بیدار ہو گیا۔ اس نے متوقع برطانوی حملے کی خبر امریکن گورنر کو دے دی۔ جنگ میں وہ خود اس کے قزاق انگریزوں کے خلاف خوب خوب لڑے۔ فتح کے بعد بطور صلہ امریکن پریذیڈنٹ میڈیسن نے لیفیت اور اس کے ساتھیوں کے جرائم معاف کر دیئے۔ ژاں لیفیت اینڈ امریکن ساحلی قزاقوں کے زمرے کی آخری کلرفل شخصیت تھا۔ ناولوں اور فلموں کا مو

امریکہ کی دوسری بڑی بندرگاہ نیواورلینز کے دریا پر اقوام عالم کے جہاز اپنے اپنے پرچم لہراتے گزر رہے تھے۔ ہندوستانی کارگو جہاز شوساگر قریب سے نکل گ سوویت روسی جہاز اڑلیسہ دور جاتا نظر آیا۔ کاش کاش امریکن اور روسی ایک دوسرے سے دوستی کر لیں۔ دنیا چین کا سانس لے۔

پرانی شوبوٹ کی وضع کی چہار منزلہ کشتی فرنچ کوارٹر کے وسط میں جیکسن اس کے سامنے سینٹ پیٹر اسٹریٹ کی گودی پر واپس آئی۔ اس نوع کے متعدد جہا سیاحوں سے لدے مسسپی پر رواں تھے۔ پچھلی صدی میں سدرن پلانٹرا زمینداریوں سے اسی قسم کے جہازوں پر سوار ہو کر نیواورلینز آتے تھے۔

ایک صبح رومان پرور RIVER ROAD PLANTATIONS کی طر جاتے ہوئے اوبر رولیشن کونج "مسسپی دریا کے کنارے کنارے گزری!

میں جگہ جگہ پلانٹرز کے پرانے مکانات۔ اونچے شاہ بلوط! گنے کے کھیت۔ دریا پر تجارتی کشتیاں چل رہی تھیں۔ بالکل اسی وضع کے دو منزلہ جارجین کولونیل مکانات اسی عہد میں سارے بنگال اور بہار اور یوپی میں تعمیر ہوئے جس میں جُوٹ اور نیل اور افیون کے انگریز پلانٹرز رہتے تھے۔ لارڈ کارنوالس کے استمراری بندوبست کے بعد فاقہ کش ہندوستانی کسان ان پلانٹرز کے نیم غلام بنے۔ یہاں امریکن ساؤتھ میں کپاس اور گنے کے پلانٹرز کے زر خرید غلام افریقہ سے منگوائے گئے تھے۔ وہ اتنی مختلف دنیائیں تھیں۔ مگر ان کا سماجی معاشیاتی ساخت یکساں۔ یہ سفید فام امریکن پلانٹرز عیش کرتے تھے۔ ان کے نیگرو غلام محنت۔ اسی طرزِ حیات کو برقرار رکھنے کے لئے یہ پلانٹرز امریکن خانہ جنگی میں کٹ مرے تھے۔ خانہ جنگی نے ہزاروں پرانے زمیندار خاندان تباہ کر دیئے۔ ان کے عالی شان مکان اسی طرح سجے سجائے سیاحوں کے لئے رکھے گئے ہیں۔ بہت سے مکان اب تک آباد ہیں۔ ایک محل کی گائیڈ لڑکیاں پچھلی صدی کی SUOTHERN BELLES کی پوشاک میں ملبوس تھیں۔ اس روائتی ساؤتھ کے متعلق اتنے ناول اور ڈرامے لکھے گئے اور فلم بنے۔ اس خطے کی لوی سی ئی میں کنکر مفقود ہیں لہذا ان مکانات کی سڑکوں پر دریائی سیپیوں کی بجری بچھی تھی۔

واپسی پر کوچ ان محلات اور ان کے نیگرو غلاموں کی کاٹجوں کو شاہ بلوط کے جھرمٹوں میں چھپا چھوڑ کر نئی ایکسپریس وے پر آگئی۔ یہ ایکسپریس وے ساٹھ ستر میل تک دلدلی جنگلوں میں سے گزری۔ پل کے دونوں جانب پانی میں استادہ اونچے درخت اور جھیل کے کنارے سرسراتے شمشاد کے جھرمٹوں کے بعد شہر میں داخل ہو کر اچانک ایک عمارت پر ایک مدراسی ڈاکٹر کے نام کا بورڈ بڑا عجیب لگا۔ "تمہاری آمد کی اطلاع ریڈیو نیوا ورلینز کو کر دی گئی تھی۔ کل وہاں چلنا ہوگا"۔

رات کو والمونٹ اسٹریٹ میں شیری نے کہا۔ دوسرے روز مسٹر رابرٹ کار نے ــــ WORLD VOICES کے آدھ گھنٹے کے انٹرویو میں ہندوستانی سیاست اور مسز گاندھی سے لے کر انڈین فلم انڈسٹری تک بے حد سوالات کئے گئے۔

"آپ کے ملک کی اتنی قدیم تہذیب ہے اور اتنی روحانی بلندی۔ پھر اتنا شدید افلاس کیوں؟"

"اتنے کم وقت میں برطانوی کولونیلزم کی اقتصادیات پر لیکچر تو نہیں دے سکتی۔ برطانیہ نے ڈیڑھ سو سال تک استحصال کیا اور اس کے بعد غلط اکنومک پلاننگ اور تیزی سے بڑھتی ہوئی بے تحاشہ آبادی۔ لیکن مغربی میڈیا میں ہندوستان کے افلاس ہی کا چرچا ہے۔ یہ ذکر کبھی نہیں کیا جاتا کہ ہندوستان اپنے سوپرسونک جیٹ طیارے بھی بنا رہا ہے اور مصنوعی چاند بھی۔"

"آپ پہلی ہندوستانی ہیں جنہوں نے اس پروگرام میں برطانیہ کی نکتہ چینی کی ہے۔ ورنہ عموماً جو خاص خاص ہندوستانی ہم یہاں مدعو کرتے ہیں۔ وہ برطانیہ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ پچھلے پروگرام میں یو۔ این کے فلاں صاحب آئے تھے، انہوں نے کہا۔"

"لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟" میں نے بات کاٹی۔ "خود آپ لوگ برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کے استحصال کے خلاف کیوں لڑتے تھے۔؟

رابرٹ کار بہت ہنس مکھ آدمی تھے۔ کہنے لگے۔ "آپ سے سوالات کے لئے کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ درکار ہے۔ اچھا ایک آخری سوال اور۔ آیت اللہ خمینی۔"

آکیو واسٹی میں پروفیسر پال اینگل نے بھی مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان میں بہت سے لوگوں نے ان سے کہا!! کاش انگریز نہ جاتے۔"

۱۹۴۷ء سے پہلے اگر کسی کو معلوم ہوتا کہ آزادی کے برسہا برس بعد لوگ ایسی خواہش

ظاہر کریں گے تو کسی کو یقین نہ آتا۔

جس روز صبح میں نیو اورلینز سے روانہ ہو رہی تھی شبیری نے کہا ایرپورٹ
جانے سے پہلے تم کو گارڈن ڈسٹرکٹ اور سینٹ لوئی کا قبرستان دکھاتی چلوں۔
گارڈن ڈسٹرکٹ امیروں کا محلہ ہے اور یہ قبرستان یہاں کی خاص چیز ہے۔
پُر فضا گارڈن ڈسٹرکٹ سے نکل کر قبرستان کی طرف جاتے ہوئے شبیری نے کہا:
"یہاں کی مٹی دلدلی ہے۔ مُردے زمین کے اندر دفن نہیں کئے جاتے سنگی میزوں کے
اوپر ان کے مرمریں تابوت رکھ دیئے جاتے ہیں۔"
برابر کی سڑک پر سے گزرتے ہوئے میں نے نظر دوڑائی۔ سفید خوبصورت مزار۔
سب زمین سے بہت اونچے ڈھائی سو سال سے اس نظر فریب شہر کے باسی مرنے کے
بعد ان انوکھی قبروں میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ زمین کے اندر نہ سہی۔ اوپر سہی مرزا غالب
کہہ گئے تھے۔ جو یوں ہوا تو کیا اور یوں ہوا تو کیا۔ انجام وہی ہے۔

الفا اور اومیگا

نیو اورلینز سے شکاگو سوا تین گھنٹے کی اڑان۔ پونے تین بجے سہ پہر شکاگو پہنچ کر چار بجے سیڈر ریپڈز کے لئے یونائیٹڈ ایر لائنز کا ہوائی جہاز شام کے ساڑھے چار بجے سیڈر ریپڈز تاریک تھا۔ تیز ہوا اور برفباری

جس وقت آیووا سٹی مے فلاور اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر باورچی خانے کا درو کھولا۔ نادیا میری ناضرت کو موجود پایا۔

"تمہاری غیر موجودگی میں۔" میری نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ "انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام میں ایک عدد ولادت ہوئی۔"

"ولادت۔؟ کس کے ہاں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"بوجھو۔"

سوچا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ "اونگا؟ لیلے؟ ایگنس۔ یا تھیا تو ہو نہیں سکتیں۔ رہیں نادیا اور فاطمہ تو یہ دونوں غیر شادی شدہ ہیں۔"

"پھر سوچو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"فاطمہ!"

"فاطمہ ڈیکے؟" میں نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔ "مگر اس کی شادی نہیں ہوئی اور نہ معلوم ہوتا تھا کہ"

"نیور مائینڈ" چند روز ہوئے رات کے دو بجے اس نے مجھے فون کیا۔ فوراً ہسپتال لے گئے۔ صحت مند بچی پیدا ہوئی۔ اسے وہاں چھوڑ کر فاطمہ تیسرے دن نیو یارک چلی گئی۔ جہاں اس کا لیکچر شروع ہونے والا تھا۔"

"سخت جان، قوی ہیکل باغی افریقی لڑکی" نادیا نے کہا۔

"اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ بچی کا باپ کون ہے۔ شاید وہ جنوبی افریقہ ہی میں موجود ہے اور اس کا ہم قوم ہے برٹ اور تھیا نے فاطمہ سے کہا ہے کہ اگر وہ چاہے تو وہ بچی کو متبنیٰ کر کے ہالینڈ لے جائیں گے۔ مگر اس نے منظور نہیں کیا۔ بن بیاہی کالی عورتوں کے ہاں یہاں بھی عام طور پر بہت بچے پیدا ہوتے ہیں اور اب گوریوں کے ہاں بھی بہت ہو رہے ہیں۔

"یہ نئی اخلاقیات کی دنیا ہے۔ مگر نجانے فاطمہ پر جنوبی افریقہ میں کیا افتاد پڑی ہو، کیا پتہ کسی نے اسے دھوکا دیا ہو۔ نہ معلوم اس کے ذاتی مسائل کیا ہیں ممکن ہے اسے ریپ ہی کیا گیا ہو۔ اسے جج کرنے یا اسے ہمدردی جتانے کا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔" نادیا نے کہا جو اپنے رویوں میں بہت مغربی تھی۔

یہی رویہ پروگرام کے باقی اراکین کا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے اور دوسروں کے معاملات میں ناک نہ ڈبونے کے زریں مغربی اصول کے تحت کسی نے اس واقعہ کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔

میں پروگرام کی مدت میں متعدد بار باہر جاتی رہی تھی اور بہت سے سیمیناروں میں شرکت نہ کر سکی تھی (موڈرن انڈین فکشن" کے متعلق سیمینار بالکل شروع ہو چکا تھا) ویسٹ یارڈ اور جمز بک اسٹور کی ادبی محافل بھی جاری تھیں۔

ایک سرد شام ہم لوگ نامور جواں سال جاپانی شاعر گوزو یوشی ماسو کو سننے ویٹ بار گئے۔ اس نے جاپانی میں اپنا کلام بلاغت نظام اور بیک وقت اس کی برازیلین بیوی اور ایک کالی لڑکی اینجلیٹیا نے اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ساتھ ساتھ ساز بجائے گئے۔ بے پناہ شور مچا۔ گوزو (اسے بھی جاپانی فلموں کا ہیرو ہونا چاہیئے تھا) اچھلا کودا فرش پر اکڑوں بیٹھ کر حلق سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ سر کے بال نوچے۔ چھت کی طرف منہ اٹھا کر چلایا۔ نوہ کی قسم کی اداکاری کی۔ اس ہنگامے میں انگریزی تراجم کو نہ سمجھنا ہی مدعا تھا۔ یہ ذرا زیادہ ہی ڈرامائی HAPPENING تھی۔ سامعین مسحور ہوئے (امریکن جاپانیوں سے بھی بہت مسحور ہیں۔) گوزو واک لینڈ یونیورسٹی میں پوئیٹ ان ریذیڈنس تھا جہاں ترقی پسند اردو شاعر نلیب الرحمٰن پروفیسر ہیں۔)

الوداعی دعوت کی رات پال اینگل کے ہاں صبح دو بجے تک شور غوغا رہا۔ ہمیشہ کی طرح (سوائے میرے) سب ناچے ایگنیس بھی ناچیں۔ اس رات وہ پہلی بار مسرور نظر آئیں۔ ایسا لگا جیسے دکی بام کی ہیروئن کچھ دیر کے لئے اپنے خول سے باہر آگئی۔ اب لوگوں نے واپس جانا شروع کر دیا تھا۔ روز دریچے میں سے نظر آتا۔ مائیکل کا اسباب لد رہا ہے۔ آج لیلے گئیں۔ نیو بلغاریہ روانہ ہوا۔ رات کو مینو لوگو سلاویہ جا رہا ہے۔ کل آرتی ایتھنز جائے گا۔ پروگرام کی طرف سے سات سو ڈالر کے ایر ٹکٹ ملک کے اندر سیر سپاٹے کے لئے ملتے تھے۔ لوگ باگ دور نزدیک کے چکر لگا کر واپس آرہے تھے۔ نادیا اور لیلی بھی گھوم آئی تھیں۔ میں چونکہ یونیورسٹیوں کی دعوت پر گئی تھی۔ سات سو ڈالر باقی تھے۔ لیکن اب برفباری شروع ہو چکی ہے اور کافی سیر کر لی ہے۔ واشنگٹن سے پرانی عزیز دوست جین ایبل کون (دیکھئے کار جہاں دراز ہے جلد دوم) کا فون آیا۔ یہاں کب پہنچ رہی ہو۔ میں نے کہا۔ جین آپا کچھ رشتے داروں نے آسٹریلیا بلایا

ہے۔ جو بر اعظم پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ لہذا فی الحال وہاں جاتی ہوں۔ لہذا وہ باقی ماندہ ساڑھے چھ سو ڈالر کرائے میں ڈال کر سڈنی کا ٹکٹ بنوایا۔

اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں میں سے پارک کے اتنے موسم تیزی سے بدلتے دیکھے تھے۔ اگست کی روشن دھوپ۔ خزاں کے لہلہاتے آتشیں اور ارغوانی رنگ۔ شام کو جب آلیو واندی پر سورج ڈوبتا سامنے وسیع آسمان پر پھیلی ہوئی شفق طویل دریچوں میں سے ایک سینما سکوپ نظام معلوم ہوتی۔ اب وہاں تاریکی تھی اور برف کے گالے آلیو واندی منجمند ہونے والی تھی۔ بہت جلد برف ہٹانے والے خودکار پل سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ نمک کے ذریعے برف پگھلائی جائے گی۔ لوگ پاگ اسکیٹنگ کریں گے اور سیڈر ریپڈز میں پہیوں کی جگہ پھسلنے والے تختے طیاروں میں لگا دیئے جائیں گے۔

لاس اینجلز روانگی کی صبح سورج نکل آیا۔ برٹ اور تھیا خدا حافظ کہنے کے لئے لوبی میں موجود تھے۔ ہگنس اور بالاز لنگ لپکے ہوئے نیچے آئے۔ اور اداسی سے مسکرائے۔ ہوالنگ اور پال فراٹے سے آکر اسی پھرتی سے بریکفاسٹ کے لئے گھر نے گئے ان کا کھانے کا کمرہ تیز دھوپ سے روشن تھا۔ پال نے سر ہلا کر کہا "یہ وقت بھی اچھا گزرا اور بہت جلد ختم ہو گیا"۔ ہوالنگ چینی تحقیق کا ایک طلائی گڈ لک تعویذ نکال کر لائیں جو ہمارے امام ضامن کی طرح چین میں طویل سفر پر جانے سے مسافر کو پہنایا جاتا تھا۔

وہ بد ھسٹ چین کی رسم تھی۔ مجھے یاد آیا۔ جب میں پہلی مرتبہ سوویٹ یونین جا رہی تھی۔ روسی قونصل۔ ان کی بیوی اور چند اور روسی بھی ہمراہ جانے والے تھے۔ روانگی سے قبل جب ہم لوگ ان کے گھر سے چلنے لگے۔ روسی قونصل کی بیوی نے اچانک اشارہ کیا۔ سب پھر بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ چپ چاپ بیٹھے رہے پھر اٹھے۔ انہوں نے کہا یہ ہمارے ہاں کا پرانا ٹوٹکا ہے۔ نیک شگون طویل سفر پر جانے سے پہلے"۔ مادیت

کے فلسفے میں اس کے شگون اور ٹوٹکے کا کہیں ذکر نہیں۔)

جرمن نژاد کالونسٹ پال، چینی ہوالنگ اور امام ضامن کی روایت والی راقم الحروف اینگلز کی پہاڑی سے اترے سامنے آلیو وانڈی بہہ رہی تھی جو روایات کے بننے اور بگڑنے سے بے نیاز اسی طرح بہتی رہے گی۔ (اگر دنیا باقی رہی)

شب گزشتہ مے فلاور کے نکڑ پر اپنے کوزی فلیٹ میں پیٹر ناضرت نے یوگنڈا کے متعلق اپنا سیاسی ناول IN A BROWN MANTLE دیتے ہوئے اس پر لکھا تھا۔

IN THE COLD DYING DAYS OF THE SEVENTIES A LAST SOUVEINIR OF THE LAND OF WAR – TO REMIND YOU THAT WE CAN NOT CHANGE OUR FUTURE WITH OUT KNOWING OUR PAST.

شکاگو۔ ڈینور۔ گرم خوشگوار کیلی فورنیا ۱۱۹ نارتھ ایجمونٹ جلال عدنان منصور تینوں بچے اپنی پڑھائی میں مصروف تھے۔ بیورلی ہلٹن اور سارا لاس اینجلز رات کو الکھوں روشنیوں سے جگمگاتا طیران گاہوں کے وسیع COMPLEX میں طویل متحرک برقی سڑکوں پر مشرق کی سمت پرواز کرنے والوں کے ہجوم رواں تھے۔ کوریا۔ جاپان۔ تائیوان۔ جزائر بحرالکاہل وغرب الہند۔ جم غفیر میں ایک خفیف سی بھنبھناہٹ اور افراتفری۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اورینٹ یہاں سے شروع ہو گیا۔

پین امریکن کا جمبو جمعرات کی صبح دو بجے لاس اینجلز سے اڑا۔ چند گھنٹے بعد ڈیٹ لائن پر سے گزرا اور جمعہ کا دن غائب ۔ نیوزی لینڈ کے شہر آک لینڈ کی پہاڑیوں پر وہ لطیف کہرہ تیر رہا تھا جس میں ماوری قبائل کو اپنے الوہی اسرار نظر آتے تھے۔ گوروں کے چہرے مہرے اور انداز برطانوی۔ قطب جنوبی کے نزدیک ایک اور انگلستان۔

آسٹریلیا۔ شاداب و خوش منظر سڈنی سرخ چھتوں والے مکان اپنے اجداد سے آسٹریلین لوگوں نے بشاش دوستانہ COCKNEY انداز ورثے میں حاصل کیا ہے۔

میرے رشتے داروں کے خوبصورت مکانوں کے احاطوں میں سُرخ جریئیم کھلے ہوئے تھے اور خودکار متحرک فوارے سبزے کو پانی دے رہے تھے۔ کرن سلطان حیدر کی حسین گلوکار بیگم شہناز (سڈنی ریڈیو میں انگریزی پروگرام آفیسر) اور ایک اطالوی نژاد جرنلسٹ خاتون نے انگریزی میں آدھ گھنٹے کا اور بہاری نژاد صلاح الدین صاحب نے اردو پروگرام کے لئے ایک گھنٹہ کا انٹرویو کیا۔ دوسرے کزن ڈاکٹر محمود زیدی بحیثیت امریکن وزیٹنگ پروفیسر یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز میں سال بھر کے لئے اقتصادیات پڑھانے میں مصروف تھے اور ایک آسٹریلین پروفیسر کے مکان میں رجو مع خاندان برائے تحقیق جزائر بیوڈا گیا ہوا تھا) مقیم تھے۔ اس مکان میں کال بیل کے بجائے ACOUSTICS اس قسم کے تھے کہ نیچے صدر دروازے پر کوئی دستک دیتا تھا تو وہ بالائی منزل کے کواڑوں پر سنائی دیتی تھی۔

آسٹریلیا میں یہ موسم گرما تھا۔ اور شام کو درختوں میں کوئل گاتی تھی اور رات کے آسمان پر وہ ستارہ جگمگاتا تھا جس کا نام کرہ جنوبی دریافت کرنے والے عیسائی "جنوبی صلیب" رکھ گئے تھے۔

انجیل مقصد کے عہد نامہ جدید یعنی مسیحی بائبل کا آخری حصہ بعنوان "یوحنا عارف کے مکاشفے" ایک قابل ذکر کتاب ہے۔ یہ JOHN EHT BAPTIST کا ہم نام ایک یہودی شاعر تھا جو عیسائی ہوگیا تھا۔ عبرانی میں سوچتا تھا اور یونانی میں لکھتا تھا۔ بائبل اسکالرز کا خیال ہے کہ یہ یوحنان رومن حاکموں کے خلاف اہلِ فلسطین کی بغاوت اور ان کے پرسیکیوشن کے زمانے میں گیلی سے ہجرت کر کے اناطولیہ کے شہر الفی سس چلا گیا

تھا۔ اس سیاسی اضطراب اور زبوں حالی کے زمانے میں اس نے قدماء حضرت دانیالؑ وغیرہ کی طرح بطور پیش گوئی موثر اور گرجدار اور تقریباً ایکس پریشنی EXPRESSIONISTIC انداز میں اپنے مکاشفے" قلم بند" کئے تھے۔ اس وقت کے اور آج کے فلسطین میں، بحاض و بے انصافی میں زیادہ فرق نہیں۔ صوفیو اور عارفوں کی پیش گوئیاں اور سکھوں کی جنم ساکھیاں بھی مضطرب زبانوں میں لکھی گئیں۔ "مریم دی سٹوری آف دی بیوٹی"۔ پردادا سید احمد علی کی وہ اد جلی کتاب جس میں میں نے شاہ نعمت اللہ ولیؒ کی نظم کا انگریزی ترجمہ دیکھا کتنی کتابیں کتنی شورشوں میں اور جلیں گی۔ کتنی ادھ جلی باقی رہیں گی (عین اس وقت ابادان اور خرم شہر کے کتب خانوں میں کیا کیا جل رہا ہو گا۔) ملبورن سے آدھی رات کو ایک معمر انگریز عورت آسٹریلین اڑن ہاتھی پر سوار ہوئی تھی او برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ لندن جا رہی تھی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی، ہم چمکیلے ہند مہا ساگر پر اڑ رہے تھے اور میری پڑوسن تلاوت انجیل میں مصروف تھی۔ مجھے بہت عجیب لگا۔ آج کل بہت کم اہلِ مغرب بائیبل پڑھتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ پچھلی نسل کی اس انگریز عورت نے ابھی اپنا ایمان نہ کھویا تھا اور نہ دبائیبل کی زبان میں) انوکھے خداؤں کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ جب وہ تلاوت ختم کر چکی میں نے کتاب مقدس اس سے لی اور یوحنا کا مکاشفہ کھولا۔

" خداوند خدا جو ہے، اور جو تھا اور جو آنے والا ہے۔ یعنی قادر مطلق فرماتا ہے کہ میں الفا اور اومیگا ہوں۔ اور اپنے پیچھے نرسنگے کی سی آواز سنی کہ جو کچھ تو دیکھتا ہے۔ اسے کتاب میں لکھ۔

" اور تخت پر جو بیٹھا تھا میں نے اس کے داہنے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھی جو اندر سے اور باہر سے لکھی ہوئی تھی اور سات مہریں لگا کر بند کیا گیا

پھر میں نے زورآور فرشتے کو بلند آواز سے یہ منادی کرتے دیکھا کہ کون اس کتاب کو کھولنے اور اس کی مہریں توڑنے کے لائق ہے اور میں اس بات پر زار زار رویا کہ کوئی اس کتاب کو کھولنے یا اس پر نظر کرنے کے لائق نہ نکلا۔ پھر میں نے دیکھا کہ برے نے ان سات مہروں میں سے ایک کو کھولا۔ اور ان چار جانداروں میں سے ایک کی گرج سنی کہ آہ!! اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے۔ اور اس کا سوار کمان لئے ہوئے ہے اور اسے ایک تاج دیا گیا۔ اور وہ فتح کرتا ہوا نکلا کہ اور بھی فتح کرے"۔ WASP-؟" اور جب اس نے دوسری مہر کھولی۔ پھر ایک اور گھوڑا نکلا جس کا رنگ لال تھا۔ اسے ایک بڑی تلوار دی گئی"۔

لال!

"اور تیسری مہر۔ اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کالا گھوڑا ہے۔ اس کے سوار کے ہاتھ میں ایک ترازو ہے"۔

کالی دنیا۔ یا عبا پوش ملا خمینی اور ان کا "اسلامی انصاف ؟"

"اور چوتھی مہر۔ زرد گھوڑا"۔

چین۔؟

"اور جب اس نے انتھاہ گڑھے کو کھولا تو گڑھے میں سے ایک بڑی بھٹی کا سا دھواں اٹھا۔ اور سورج اور ہوا تاریک ہوگئی"۔

ایٹم بم ؟ فضا کی آلودگی ؟

"اور ان میں سے ہر ایک کو سفید جامہ دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اور تھوڑی مدت آرام کرو۔ جب تک تمہارے ہم خدمت بھائیوں کا بھی شمار پورا نہ ہولے جو تمہاری طرح قتل ہونے والے ہیں"۔

"ایران میں مزید دو سو آدمی فائرنگ اسکواڈ سے ہلاک"۔ ملبورن کے ایک

شام کے اخبار کی ایک سرخی متبسم لمبا تڑنگا آسٹریلین اسٹورڈ صبح کی چاء کے ساتھ اخبار سامنے رکھ گیا۔

نہیں لوحنا کے مکاشفے کی یہ عصری تاویلیں کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں۔ میں نے کنگ جیمز بائیبل بند کر کے انگریز خاتون کو واپس کر دی۔

آسٹریلین اڈرن ہاتھی سانتا کروز پہ اترا۔ ہوائی جہاز کی مغربی تنظیم اور اخلاق کے ماحول سے باہر آکر اچانک مشرق ایک مراٹھی خاتون نے جو سڈنی میں سیٹل ہو چکی تھیں اور گھر والوں سے ملنے آئی تھیں۔ ایک کاؤنٹر پہ بیٹھے کلرک سے کسٹم والوں کا راستہ دریافت کیا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ خاتون نے دوبارہ پوچھا۔ اس نے جمائی لی اور بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ہوا پیما سے اترنے والے مغربی جو شاید پہلی بار مشرق آئے تھے بد نظمی شور و غل اور افراتفری سے بھونچکے ہو کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

ادھر کسٹم کاؤنٹر پہ ایک ساری پوش خاتون کے سوٹ کیس میں سے بیرونی COSMETICS اس طرح نکلے چلے آرہے تھے جس طرح گو گیا پاشا کے طلسمی صندوقچے سے کبوتر برآمد ہوتے تھے۔

باہر ایک ہٹے کٹے تہمد پوش مسلمان نوجوان فقیر نے میرے سامنے آکر نعرہ لگایا۔ "دے حاجی ملنگ بابا کے نام پہ"!

پیارے پڑھنے والو۔ یاد رکھو اور پہچان لو۔ کہ جہد البقا میں بچھڑنے اور ہارنے والی قوموں کی یہی نشانیاں ہیں۔

ایر پورٹ پر خریدے ہوئے اخبار پر نظر ڈالی: ایران و عراق کے مابین جنگ کے آثار۔ (پیارے پڑھنے والو۔ پند و نصیحت میرا منصب نہیں، مگر ایک بات یاد آتی ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں مسلمانوں کی ایک سو اٹھائیس سلطنتیں

تباہ ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر خود مسلمانوں ہی نے ایک دوسرے کے خلاف بھیانک
لڑائیاں لڑلڑ کر نیست و نابود کی ہیں ۔

اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا قول یاد آتا ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ جب اللہ
ہمارا اور صرف ہمارا تھا تو اس نے خلافتِ عباسیہ کا وارث ہلاکو اور اندلس کا مالک
ازابلا اور فرڈی ننڈ کو کیوں بنایا اور مغلوں کا تاج کوئن وکٹوریہ کے سر پر کیوں رکھ
دیا۔ مشرقی یورپ سے ہمارے آثار کیوں مٹا دیئے۔ روس میں اسلام پر پہلے زار
اور پھر کمیونسٹوں کو کیوں غالب کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت طویل فہرست ہے

ٹیکسی نے ساؤتھ بمبئی کا رُخ کیا۔

میں نے سوچا وہی مثل ہے کہ

کہاں گئے تھے ؟ کہیں نہیں۔ کیا لائے کچھ نہیں ۔